مریم واصف خان*
محمد عمر حبیب (مترجم)**

استشراقی کتھا اور شمالی ہندوستانی ادب میں تبدیلی

Abstract:

The Oriental Tale and the Transformation of North Indian Prose Fiction

The eighteenth-century English Oriental tale has in recent scholarship been read as both productive and dissident. But the legacies of this literary genre in the Indian colony and its role in the formation of a world literature remain mostly unstudied. The formation of colonial institutions such as Fort William College, Calcutta (1800) inaugurated the standardization of the fluid North Indian language complex into the religiously demarcated vernaculars Urdu and Hindi. The imperially patronized production of the Oriental tale as both a literary and a pedagogical form, exemplified by Mir Amman's *Bāgh-o Bahār* (The Garden and the Spring) among other works, began the process of the large-scale and the nearly irreversible reorganization of North Indian literary traditions. The rise of a colonial nexus of educational institutions for natives codified the Fort William works as canonical, while narratives such as the dāstān that operated at a distance from the colonial ambit became, at best, peripheral to a modern Urdu literature.

Keywords: World Literature, Oriental Tale, Fort William College, Colonial Literature.

اٹھارھویں صدی، عالمی ادب، مشرق و مغرب کا تنازع اور ٹرانسلیٹیو (translatio) ایسی تمام تر اصطلاحات (تراکیب) ہیں جنھوں نے ایڈورڈ سعید (Edward Said_۱۹۳۵ء-۲۰۰۳ء) کے اورینٹلزم (*Orientalism*_۱۹۷۸ء) کے زور کے رد میں کی جانے والی کاوشوں کو جلا بخشی ہے۔ بالخصوص سرینواس اَراوَمُدَن (Srinivas Aravamudan_۱۹۶۲ء-۲۰۱۶ء)[1] نے مابعد نوآبادیاتی تنقید سے ''مغربی سیاسی اور ثقافتی بالادستی پر جاری وضاحتوں کے ترقی پسند (جدید) متبادل'' پیش کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ بعینہٖ سنکر متھو (Sankar Muthu)[2] اپنی کتاب اینلائٹمنٹ اگینسٹ ایمپائر (*Enlightenment against Empire*_ ۲۰۰۳ء) میں ڈینس ڈائرٹ (Denis Diderot_ ۱۷۱۳ء- ۱۷۸۴ء)، امانویلین کانٹ (Immanuel Kant_۱۷۲۴ء- ۱۸۰۴ء)، اور یوہان گاتفرید ہردر (Johann Gottfried Herder_۱۷۴۴ء- ۱۸۰۳ء) کے کام میں سامراجیت کے خلاف دانش کی نشان دہی کرتا ہے اور سراج احمد[3] نے والٹیئر (Voltaire_۱۶۹۴ء-۱۷۷۸ء)، جان ڈرائیڈن (John Dryden_۱۶۳۱ء- ۱۷۰۰ء) اور دیگر کی جانب سے یورپی برتری پر تنقید میں معاشی کشیدگی کا جائزہ لیتا ہے۔ اپنے دائرۂ کار میں بظاہر عالمگیری حیثیت رکھتے ہوئے تینوں کاوشیں طویل اٹھارھویں صدی کے ساتھ قابلِ ذکر نسبت رکھتی ہیں۔ تاہم ان میں سے ہر ایک (تحقیق) ثقافتی (بالخصوص ادبی اور لسانی) کایاپلٹ کو زیرِ غور نہیں لاتی جسے اٹھارھویں صدی کے استشراقی تصورات اور ڈھانچے نام نہاد اورینٹل سپیس (Oriental Space) میں بذاتِ خود راسخ کر چکے ہیں۔

بطورِ خاص سرینواس اَراوَمُدَن[4] اٹھارھویں صدی کو مابعد نوآبادیاتی نقادوں کے لیے مفاہمانہ ساعت کے طور پر دیکھتا ہے اور ایسے ''قدیم اور روشن خیال عالمی ادب'' کو تسلیم کیے جانے کا قائل ہے جو اس بات کو عیاں کرتا ہے کہ ''عمودی قومی تواریخ'' کے ذریعے کیا کیا ''مبہم'' بنایا گیا ہے۔ آنتین گالاند (Antoine Galland_ ۱۶۴۶ء-۱۷۱۵ء) کی الف لیلہ (۱۷۰۷ء) اور ابنِ طفیل (۱۱۰۵-۱۱۸۵) کی حیی بن یقظان (قریباً بارھویں صدی) قابلِ جرح مثالوں پر استوار آروامان کا استدلال ''translatio یا کایاپلٹ کے اُس قدیم اصول'' کو آگے بڑھاتا ہے جس کے تحت ''تحاریر بآسانی اور بلادقت مختلف زبانوں میں منتقل ہوتی رہیں''[5]۔ اَراوَمُدَن کے مطابق ایسی تحاریر ''روشن خیال استشراقیت کو قیامِ عمل میں لانے والی مشرق و مغرب کے مابین ثقافتی تبدیلی'' کی معنی خیز مثالیں ہیں[6]۔ ایڈورڈ سعید کے مقالے ''ٹریولنگ تھیوری'' (travelling theory) سے اپنے استدلال کو ہم آہنگ کرتے ہوئے آروامان، الف لیلہ اور حیی بن یقظان کے یورپ کی جانب مشہورِ زمانہ سفر کو استشراقیت کی اچھی علامات کے طور پر دیکھتا ہے۔ لیکن ایڈورڈ سعید نہایت محتاط ہے کہ ایسی تحاریر اور خیالات (بالخصوص جب شاہی اور سامراجی اداروں کے توسط سے پہنچیں تو) بالعموم مزاحمت کا سامنا کرتے ہیں اور نتیجتاً غیر مانوس ثقافت میں پنپتے ہوئے قطعی مختلف معانی اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے عالمی ادب کے وجود پر اس وقت تک بحث نہیں کی جا سکتی جب تک کہ

نوآبادیات اور اس کے ثقافتی لائحۂ کار کے سوال کو پیشِ نظر نہ رکھا جائے۔

عامر آر۔ مفتی (Aamir R. Mufti۔ پ: ۱۹۵۹ء)[7] نشان دہی کرتے ہیں کہ استشراقیت اور عالمی ادب کے ''اداروں'' کے درمیان نہایت گہرے ربط کی ابتدا ''دورِ جدید کے آغاز'' سے ہی ہوتی ہے، یعنی باقاعدہ نوآبادیات سے کچھ ہی قبل مگر اس عمل اور اس کے امکان سے زیادہ دور بھی نہیں۔ بطور انگریزی ادب کے آغاز کے محرک 'نوآبادیاتی اختیار' کے متعلق گوری وشواناتھن (Gauri Viswanathan۔ پ: ۱۹۵۰ء) کے استدلال کو آگے بڑھاتے ہوئے بشمول دیگر، عامر آر مفتی، رشمی ڈیوب بھٹناگر (Rashmi Dube Bhatnagar,۔ پ: ۱۹۵۷ء) اور ونے دھاڑوار (Vinay Dharwadker۔ پ: ۱۹۵۴ء) تجویز کرتے ہیں کہ نوآبادیوں میں قومی ادب کی اختراع میں فکرِ نشاۃ ثانیہ کا عمل دخل تھا[8]۔ ولیم جونز (William Jones۔ ۱۷۴۶ء-۱۷۹۴ء) کی شروع کردہ لسانی اصلاحات اور ''ہندوی'' کی دریافت پر ازحد توجہ دیتے ہوئے ایسی ادبی اصناف کو بڑی حد تک نظرانداز کیا گیا ہے جو مقامی ادب کو تشکیل دیتی ہیں۔ شمالی ہندوستان میں ابھرنے والی قومی اور مذہبی وابستگی کی حامل زبانوں کے ظہور کو عامر آر۔ مفتی ''پیچیدہ دورخی غیر مسلسل/مختلف ادوار پر محیط عمل'' کے طور پر بیان کرتے ہیں[9] جس کی بنیاد استشراقی محققین جیسا کہ جونز نے ڈالی اور نوآبادیاتی اداروں نے ترویج کی جن کا مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی کے شمالی ہند کے علاقہ میں لسانی، جمالیاتی اور وسیع تر دائرۂ کار میں ثقافتی اطوار کی تشکیلِ نو تھا۔ تبدیلی کی اس مہم کا ایک نہایت اہم پہلو اٹھارھویں صدی کا ادب تھا جسے استشراقی کتھا کہتے ہیں۔

نشاۃ ثانیہ کے عالمی ادب کے وجود اور اثرات کو تمام تر بحث کا مرکز بنانے پر بڑھتے اصرار کی بنا پر استشراقی کتھا کو اس کی غیر سامراجی، نسائی اور آفاقی نوعیت کی بنا پر سراہا جاتا ہے۔ اَرا وُمُدَن کی حالیہ کتاب اینلائٹمنٹ اورینٹلزم (Enlightenment Orientalism۔ ۲۰۱۲ء) اٹھارھویں صدی کی صنف کو ''سیاسی جدت اور نشاۃ ثانیہ کی عوامی ثقافت سے منسلک انتہائی اہم لیکن غلط فہم فنکشن (function) کی حامل روایتی صورتوں کی شبیہ'' کے طور پر بیان کرتی ہے[10]۔ یورپ میں ظاہر ہونے اور اثر رکھنے کے باوجود استشراقی کتھا کو ایک ''سادہ'' صنف گردانا گیا ہے۔ اَرا وُمُدَن اس کا رد کرتا ہے کہ اٹھارھویں صدی کی استشراقی کتھا درحقیقت نہایت ''دقیق صنف'' ہے جس نے انیسویں صدی کے استشراقی بیانیے کے برعکس اپنی ''تجرباتی، ممکنہ اور غیر بنیاد پرست'' طرز کی بنا پر ''مغربی قارئین کو رد'' کر دیا[11]۔ جیسا کہ استشراقی کتھا کو اٹھارھویں صدی کا ایک ڈیسیڈنٹ (dissident) یا مفید عمل گردانا جاتا ہے، تاہم نوآبادی پر اس کے شدید اثرات کا ذکر نہیں ملتا۔ ایک اختلافی ہیئت کی بجائے قبل از نوآبادیات، عالمی ٹرانسلیٹو (translatio) یا منصفانہ عالمی ادب کے پرانے شگون کے حسنِ اتفاق کے طور پر

استشراقی کتھا کو کرسٹوفر پرانڈرجسٹ (Christopher Prendergast۔ ۱۹۴۲ء) کے بیان کردہ یوروکرونولوجی (eurochronology) کی علامت سمجھا جا سکتا ہے[۱۲]۔ ایملی ایس اپٹر (Emily S Apter۔ ۱۹۵۴ء) استشراقی کتھا کی تعریف ''ادبیت کے مغرب پر مرکوز مغربی معیارات جو (غیر مغربی ادبوں کی) لوک اور زبانی ثقافت کے قریب درجہ بندی کرتے ہیں'' کے طور پر کرتا ہے[۱۳]۔

بجا طور پر استشراقی کتھا مشرقی یا ہندوی ادبی صنف نہیں ہے۔ اُن (اصناف) کے لیے بہت سے اور نام موجود ہیں بشمول فارسی اور اردو رومانوی اور فرضی اصناف جنھیں داستان اور قصہ کہا جاتا ہے۔ بہرحال استشراقی کتھا نوآبادی میں وجود رکھتی تھی۔ اس مغربی صنف کے ذریعے وضع کردہ عمیق تبدیلی کی ایک اہم مثال شمالی ہندوستان کی مقامی زبانوں کی تقسیم ہے: یعنی اردو اور ہندی۔ ارتداد سے کہیں آگے، مصنوعی طور پر تیار کردہ زبانوں میں راسخ استشراقی کتھا کو انیسویں صدی کے دوران شمالی ہندوستان کی کالونی میں تجدید شدہ اختیار اور ثقافتی مقاصد کی تکمیل کا استحقاق حاصل تھا۔ نوآبادی میں اس کا ظہور، نتیجتاً اس کا فروغ، اور ثقافتی وضع کاری سامراجی اداروں کے ذریعے ہوئی بجائے اس کے کہ یہ جمالیاتی رواجات کے تحت کی جاتیں جنھیں مایوس کن حد تک جدید ادبیت کے مغربی معیارات سے خارج کر دیا گیا تھا۔

میں اپنے مقدمے کو ہندوستانی نوآبادی کے پس منظر میں پیش کرتی ہوں جہاں استشراقی کتھا ایک تعلیمی نصاب تھا جو استشراقی اداروں میں ابتدائی طور پر افسران کو پڑھانے کے لیے ترتیب دیا گیا تاہم بعد ازاں مقامی لوگوں کے زیرِ مطالعہ بھی آیا۔ ہندوستان میں قدم جمانے سے قبل استشراقی کتھا برطانیہ میں پھلی پھولی، جہاں گالاند کی الف لیلہ کے بعد سینکڑوں انگریزی افسانوی کاوشیں منظر عام پر آئیں جن میں خلافتِ عثمانیہ کو جغرافیائی محل وقوع کے طور پر چنا گیا اور زیادہ تر کسی ظالم، بربری سلطان یا خلیفہ کو مرکزی کردار بنایا گیا۔ ابتدائی ہندوی مستشرقین جیسا کہ جونز نے متمول مشرقین پر طبع آزمائی کے لیے شاعری اور افسانوی اصناف کو منتخب کیا، اس تاثر کو تقویت دیتے ہوئے کہ استشراقی کتھا دراصل استشراق یا مشرق کے لیے ایک موزوں ترین ادب کا حصہ تھا۔ کلکتہ میں قیام کے دوران جونز اور اس کے ساتھی افسران نے ہندوستانی زبانوں کی تعلیم کو منظم کرنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لیے ابتدائی طور پر بہترین کلاسیکی زبانیں جیسا کہ سنسکرت اور فارسی کو چنا گیا۔ جونز کے بعد جان گلکرسٹ (John Gilchrist۔ ۱۷۵۹ء۔ ۱۸۴۱ء) آیا جو ہندوستان کی مقامی زبانوں کے تصور کو محض انتظامی نقطۂ نظر کے تحت زیرِ غور لایا اور انھیں ادارتی صورت دی۔ لسانی تعلیم کے لیے مناسب ترین ذریعے کے طور پر استشراقی کتھا کے متعلق اپنی موزونیت اور نظریاتی نہج کے ذریعے گلکرسٹ نے شمالی ہندوستان میں ادبیت اور زبان کے رائج کو مکمل طور پر بدل دیا۔

انھی کوششوں میں ایک اور نمایاں نام فورٹ ولیم کالج (Fort William College) کا تھا جو ۱۸۰۰ء میں لارڈ ویلیزلی

(Lord Wellesley۔۱۷۶۰ء۔۱۸۴۲ء) نے برطانوی افسران کی مقامی زبانوں (''ہندوستانی''، فارسی، برج اور بنگالی) میں تربیت کے واسطے کلکتہ میں قائم کیا۔ تیسرے گورنر جنرل ہند نے گورنس کے نقطۂ نظر کے تحت باقاعدہ طور پر استشراقی لسانی منصوبے کی توجہ کلاسیکی زبانوں کی دریافت اورفہم سے [گزشتہ گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز(Warren Hastings۔۱۷۳۲ء۔۱۸۱۸ء) کی چاہت کے برخلاف] تبدیل کر کے جدید لسانی علوم کی ایجاد اور تعینِ معیار کی طرف مبذول کر دی۔ لسانی ادب کی ترویج کا آغاز فورٹ ولیم کالج سے ہوا جس نے نوجوان افسران اور ہم منصب مقامی افراد کے لیے مشرق کے ''ادب'' کی داغ بیل ڈالی۔ انگریز افسران کو ہندوستانیوں کی فطرت اور زبان پڑھانے کے لیے خود ساختہ ماہرِ لسانیات گلکرسٹ کی زیرِ نگرانی کالج نے ان زبانوں میں سلسلہ وار سبق آموز مختصر کہانیوں کو نصابی کتابوں کے طور پر متعارف کروایا۔ بظاہر مقامی لکھاریوں سے لکھوائی گئی یہ تحاریر استشراق کی ''استشراقی کتھائیں'' تھیں۔ اٹھارھویں صدی کی انگریزی استشراقی کتھا کی مثالوں سے نشو ونما پانے والی یہ کتھائیں شمالی ہند میں پہلے سے موجود ہم پلہ افسانوی ادب سے موضوع اور اسلوب بیان کے اعتبار سے بہت کم مطابقت رکھتی تھیں۔ عامر آر۔ مفتی کے مطابق فورٹ ولیم کالج منصوبے کا مقصد تھا:

> مذہبی اختلافات کے تحت دو یکسر مختلف صورتوں میں مقامی زبانوں کا تعینِ معیار کرنا[۱۴]۔

اشرافیہ کی زبانوں میں سے اردو، برج بھاشا، ہندوی اور کھڑی بولی شامل تھیں۔فورٹ ولیم کالج سے قبل اردو کا اسلام سے کوئی خصوصی تعلق نہ تھا، نہ ہی کسی مقرر یا مصنف کی مذہبی وابستگی کا پتا ملتا ہے۔ بعینہٖ ہندی کی اصطلاح اردو کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتی، تھی سنسکرت یا ہندو مذہب سے کوئی ربط نہ رکھتی تھی[۱۵]۔ میرا موقف صرف یہ ہے : شمالی ہندوستانی نوآبادی میں انگریزی استشراقی کتھا کی میراث نے محض افسانوی ادبی روایت سے کہیں آگے کی سطح پر انقلاب برپا کیا؛ عرب-اسلامی اور سنسکرت-ہندو خطوط پر شمالی ہندوستان کی زبانوں کی تعبیرِ نو کے لیے یہ نہایت سنگین ہتھیار بن گئی۔

فورٹ ولیم کالج اور اس کے ادبی منصوبے کے مصنوعی مآخذ اور وسیع تر اثرات کی ایک مثال میر امن (۱۷۴۸ء-۱۸۰۶ء) کی باغ و بہار (۱۸۰۴ء) ہے[۱۶] جو کہ چار خانہ بدوش (آوارہ منش) درویشوں کی دل چسپ مہمات پر مبنی کہانی ہے۔ کالج میں مرتب شدہ اس کتاب کا مقصد نوجوان انگریز افسران کو معیاری مقامی زبان سے متعارف کروانا تھا۔ یہ کتاب جدید اردو کی ایک نمائندہ کتاب بن گئی اور اسے بطورِ نصاب مقامی افراد کے سکولوں اور کالجوں میں پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی (East India Company) اور بعدازاں حکومتِ ہندوستان کی جانب سے نافذ کیا گیا[۱۷]۔ انیسویں صدی میں متعدد بار انگریزی ترجمہ ہونے کے باعث باغ و بہار نے دارالحکومت میں بطورِ استشراقی کتھا یا ''رومانوی داستان'' مقبولیت پائی۔ جب نوآبادیات

سے قبل شائع ہونے والے رجب علی بیگ سرور(۱۷۸۵ء-۱۸۶۹ء) کے فسانۂ عجائب(۱۸۴۳ء)[۱۸] اور داستانِ امیر حمزہ(۱۸۰۵ء) سے باغ و بہار کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ باغ و بہار ایک غیر متسلسل اور زمان و مکاں کے اعتبار سے نامناسب معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اوّل الذکر یہ دو کاوشیں، وسیع اور متنوع ادب کی نمائندہ مثالوں کے طور پر، شمالی ہندوستان میں استشراقی اداروں (جیسا کہ فورٹ ولیم کالج) کے قیام کے بعد کی دہائیوں میں جمالیاتی روایات کی تدوینِ نو کی مکمل توثیق کرتی ہیں۔

لسانی استشراقی کتھا کی جانب: فورٹ ولیم کالج اور جان گلکرسٹ

اگرچہ اٹھارھویں صدی کی ہندوی استشراق کو بنیادی طور پر فلسفیانہ کارناموں کی بنیاد پر سراہا جاتا ہے، لیکن ہندوی استشراق اور اس کی میراث جونز اور اس کے ہم عصر ساتھیوں سے کہیں وسیع پیمانے پر پھیل گئی۔ سنسکرت، عربی اور فارسی سے ترجمہ شدہ قانونی اور مجوزہ ''ادبی'' بے شمار تحاریر کے ذریعے ''گم شدہ'' ہندوستانی ثقافت کی ابتدائی دریافتوں نے آئندہ دہائیوں میں ایک ''جدید'' ادب کی بنیاد ڈالی۔ نوآبادیاتی بنگال میں جونز کے بیشتر کام کے مقصد کو مفتی ''سنسکرت پر مرکوز ہندوستانی زبان کو اکٹھا کرنے کے عمل'' کے طور پر بیان کرتا ہے[۱۹]۔ بنیادی طور پر ہیسٹنگز کے زیرِ نگرانی مقامی عدالتوں میں ایک قاضی مقرر کیا گیا۔ ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل جونز (پہلے استشراقی تحقیقی ادارے) دی ایشیاٹک سوسائٹی(The Asiatic Society)اور اس کے سالانہ جریدے ایشیاٹک ریسرچز (Asiatic Researches) کا بانی بھی تھا۔ لیکن وہ کسی حد تک گلکرسٹ کا جانشین تھا جس نے نہایت سرگرمی سے استشراقی کتھا کو ہندوستان میں مقامی زبانوں کی ترویج کے لیے تشکیل دیا۔ ہندوستان کی ''بلند پایہ مقبول زبانوں'' کے خودساختہ محقق ''گلکرسٹ'' نے ہندوستان میں فورٹ ولیم کالج میں اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے متعدد سال گزارے جہاں اس کی ان تھک جدوجہد کا مدعا و مقصد ''ہندوستان'' میں ادب کی تعمیرِ نو (احیا) تھا[۲۰]۔ ہندوستان میں اپنی امنگ کا اظہار کرتے ہوئے گلکرسٹ لکھتا ہے کہ:

> ہیسٹنگز اور جونز کے دور میں تعلیم کی استشراقی چکاچوند مشرقی علوم کی قبل از وقت ظاہر ہونے والی روشنی کے سامنے ماند پڑ جائے گی اور وہ برطانوی ہندوستان کی خوشی اور خوش حالی کی تصدیق کرے گی[۲۱]۔

جونز نے ایشیاٹک سوسائٹی کے ذریعے ہندوستانی کلاسیکی علوم کے احیا کی سعی کی جب کہ گلکرسٹ نے عالمی ہندوستانی زبان کی اپنی خواہش کی غرض سے فورٹ ولیم کالج کو استعمال کیا۔ اٹھارھویں صدی میں استشراقی کتھا کی پیچیدہ تاریخ میں کالج نے اشاعتی عمل، استشراقی علما وفضلا اور مقامی کاتبوں اور منشیوں سے پُر ایک نئے دور کا آغاز کیا جو کہ اب ہندوستانی

نوآبادی میں نہایت اہمیت کا حامل ہے[۲۲]۔ دہائیوں تلک ہندوستان میں استشراقی محققین کو مستحکم کرنے کے پیشِ نظر فورٹ ولیم کا نصب العین کمپنی کے افسران کو تربیت کے ذریعے ''سیاست دان، مجسٹریٹ، ایلچی اور صوبوں کے گورنر'' بنانا تھا[۲۳] جب کہ کالج نے سائنسی اور یورپی کلاسیکی علوم بھی متعارف کروائے، تاہم بنیادی طور پر اس کی توجہ کا محور ہندوستان میں آنے والے نوجوان انگریزوں کو متنوع (بشمول فارسی، عربی، ہندی، برج، مراٹھی اور تیلگو سمیت بے شمار) مقامی زبانوں سے روشناس کروانا تھا۔ گلکرسٹ اور ہنری کولبروک (Henry Colebrooke۔ ۱۷۶۵ء-۱۸۳۷ء) جیسے خودساختہ علما کی راہ نمائی میں فورٹ ولیم کالج کی نومولود زبانوں کے نصابِ تعلیم کے ذریعے ابھرنے والے نظریات کو عموماً استشراقی فردِ واحد کی ذاتی آرا سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ بیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج پر ہونے والی تحقیقات کا رجحان کچھ ایسا ہے کہ ادارے کو جدید ہندی اور اردو زبانوں کو علمی اساس فراہم کرنے والے ادارے اور 'مقامی لسانی اور ثقافتی احیا کے سرپرست'' کی حیثیت سے خراجِ تحسین پیش کیا جاتا ہے[۲۴]۔

تاہم مفتی اور بھٹناگر[۲۵] بحث کرتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج ایک ایسا ادارہ تھا جہاں نوآبادی کی ''لسانی ڈسپلننگ''(disciplining) وقوع پذیر ہوئی۔ درج بالا ''جدید زبانیں'' مستشرقین کی جانب سے ''تحفتاً'' نہیں ملیں بلکہ مجموعۂ لسان میں ٹوٹ پھوٹ کا موجب بنیں جس نے سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں شمالی ہندوستان میں حروف (رسوم الخط) کی ثقافت کو جنم دیا۔ گلکرسٹ کی رہنمائی میں وسیع پیمانے پر مگر مختلف طور پر استعمال ہونے والی ہندی یا ہندوی کے منصوبے کا اگر ذکر کیا جائے تو اس کا دفتری طور پر درج شدہ نام ''ہندوستانی'' تھا[۲۶]۔ فارسی، عربی اور ترکی مستعارات کے مابین اگرچہ ہندی اور ہندوی مقامی زبانوں کے متنوع اسلوب کی کم ہی نشان دہی کرتی تھی، مگر گلکرسٹ نے ان دو اصطلاحات کو ''بلاشرکتِ غیرے ہندوؤں کی میراث'' قرار دیا اور چنانچہ ہندوستانی اصطلاح کو ہندوستان کی اُس قدیم زبان کے طور پر اس کا اطلاق کیا جس نے مسلمانوں کی آمد سے قبل فروغ پایا[۲۷]۔

نتھانیل ہالہیڈ (Nathaniel Brassey Halhed۔ ۱۷۵۱ء-۱۸۳۰ء) اور جونز جیسے پیش رو مستشرقین کے موقف پر اپنی رائے دیتے ہوئے گلکرسٹ نے ہندوستانی زبانوں کی فرہنگ ''مذہب و زبان کے باہمی ربط پر استوار'' ایسی تشریحات کی بنیاد پر ترتیب دی[۲۸] جو اس راسخ یقین پر مبنی تھیں کہ سنسکرت ہندوستان کی تمام زبانوں اور ادب کا ''بنیادی ماخذ'' ہے۔ ''ہندوستانی'' سمیت فارسی، ترکی اور عربی جیسی زبانیں ہندوستان پر بیرونی حملہ آوروں کی زبانوں سے مقامی زبان کی آمیزش کے ذریعے وجود میں آئیں[۲۹]۔

فورٹ ولیم کالج میں گلکرسٹ کی سرپرستی میں شائع ہونے والی مخصوص افسانوی نثر سے زبان کی تعبیر مزید آگے بڑھی۔ استشراقی کتھائیں اب زبانوں کی ہدایات کے واسطے لکھی جانے لگیں۔گلکرسٹ اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ ''ہندوستانی'' جسے بعد ازاں غلط طور پر ''اردو'' کا نام دے دیا گیا(جب کہ ثانی الذکر اشرافیہ اور مہذب طبقے کی ترجمانی کرتی تھی) جدید ادب سے عاری ہے، چنانچہ اس نے ''ہندوستانی'' پر ''متعلقہ..... مفید'' کاوشوں کے ذریعے ''استشراقی ادب کے فروغ'' کی ذمہ داری سنبھال لی[۳۰]۔کالج میں اس کے قیام کے دوران مرتب ہونے والی دو کتابیں نہایت دل چسپ ہیں۔ پہلی دی اورئینٹل فیبلسٹ(The Oriental Fabulist۔ ۱۸۰۳ء) ایسپ کے قصوں کی کتاب ہے جس کا ترجمہ ہندوستان کی تجویز کردہ مقامی اور کلاسیکی زبانوں میں شائع کیا گیا۔ دوسری باغ و بہار کالج کے منشی میر امن کا ہندوستانی میں مرتب کردہ فارسی قصوں کا ایک مبینہ ترجمہ ہے جو چار درویشوں کی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ مقامی زبانوں میں یہ استشراقی کتھائیں اس بات کی پہلی علامت ہیں کہ کیسے مغربی افسانوی بصیرت کو نو آبادی میں پہلے سے موجود جمالیاتی روایات پر نافذ کر دیا گیا۔

رابرٹ ڈوڈسلے (Robert Dodsley۔۱۷۰۴ء-۱۷۶۴ء) کے ترجمے کی بنیاد پر ایسپ کے قصوں کے پہلے انگریزی پھر رومن ''ہندوستانی''، ''فارسی''، ''برج''، ''بنگالی'' اور بالآخر ''سنسکرت'' میں تراجم شائع کیے گئے[۳۱]۔اَرامُدَن اوّلین قصوں مثلاً دی فیبلس آف بیدپائی (*The fables of Bidpai*۔۱۶۸۸ء) کو مفید تسلیم کرتا ہے کیوں کہ ان میں موجود ''صریح بالواسطہ'' روایت 'readerly hermeneutics' معانی فراہم کرتی ہے، لیکن وہ ڈوڈسلے کے فراہم کردہ اٹھارھویں صدی کے قصوں میں اخلاقیات کے مضمرات کے متعلق محتاط دکھائی دیتا ہے۔ اخلاقی سبق کے ساتھ سادہ اسلوب پر مبنی ڈوڈسلے کے قصے گلکرسٹ کی نظر کرم پاتے ہیں کیوں کہ وہ اُن کے ناصحانہ مضمرات کو فورٹ ولیم کالج کے ادبی منصوبے کے لیے ناگزیر سمجھتا ہے۔

گلکرسٹ کی زیرنگرانی مختلف زبانوں میں کیے جانے والے تراجم میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک اخلاقی سبق نتھی کیا گیا ہے، چنانچہ وہ استشراق میں ایک نئے مقصد کے تحت استشراقی کتھا کو ترتیب دیتے ہیں۔دوسرے قصے میں مینڈک اپنی جمہوری حکومت تلے بار بار نئے حکمران کا مطالبہ کرتے ہیں یہاں تک کہ مشتری وہاں ایک سارس نازل کرتا ہے جو سب باشندوں کو کھا جاتا ہے۔ نتیجہ: ''نرم اور مہربان حکمرانوں کو کچھ خامیوں کے ساتھ برداشت کرنا ظلم و جبر کی بڑی بلاؤں کا خطرہ مول لینے سے بہتر ہے[۳۲]۔''

سترھویں صدی کے ایک قصے کا نتیجہ ہی ہے کہ: ''کسی شخص کی جانب سے شکریے کی کم از کم حد یہ ہے کہ وہ اپنے

محسنین پر ظلم و زیادتی سے باز رہے''۳۳۔ تیرھویں صدی کے ایک قصے جس میں ہرن کی خودنمائی اس کی موت کا سبب بنتی ہے۔''ہم عموماً اپنے کارآمد اوصاف کی نسبت ظاہری اوصاف کو ترجیح دینے کی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں''۳۴۔

یہ نتائج اوّلین نوآبادیاتی حکمرانی کے متعلق استشراقی اور سامراجی تشویش کو عیاں کرتے ہیں (اسی قسم کی تشویش گلکرسٹ کی دیگر تحاریر میں بھی ملتی ہے)۔

آخری سبق اس لحاظ سے اہم ہے کہ گلکرسٹ اسی ابتدائی ادبی روایت کو''ہندوستانی'' کے افسانوی ادب کی بنیاد کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔اس مقصد کے تحت گلکرسٹ استشراقی کتھا کو اسلوب اور متن دونوں لحاظ سے سبق آموز بنایا ہے۔ اگلی دہائی میں ایک بے زینت زبان کی چاہت نے شمالی ہندوستان میں جمالیات اور حروف کی ازسرِ نو دریافت کی ضرورت کو جنم دیا۔ بلاشبہ انگلستان میں ادبی ترجیحات کی''زبان ، بلاتصنع اور سادہ'' کی جانب تبدیلی سے سب ہی واقف ہیں۳۵۔ الف لیلہ کے مقبول عام ترجمے اور مقبول استشراقی کتھاؤں میں نمایاں یہ طرزِ نگارش سکاٹش نشاۃ ثانیہ کی دیرپا خصوصیت میں شمار ہوتی ہے۔ انگلستان میں فوری طور پر یہ رائج ہوا اور اس کی وسیع تر چکاچوند کی وجہ سے اسے ہندوستانی نوآبادی میں لسانی تعلیم کے لیے ایک موزوں تدریسی ذریعہ سمجھا گیا۔گلکرسٹ اپنی دل چسپی کا محور فورٹ ولیم کالج کے ہدف سے وسیع تر اس امید پر کرتا ہے کہ:''ان قصوں کے ترجمے نے ہندوستانیوں میں اس قسم کی مشق کا ذوق بڑھا دیا ہے،جس کو زیرِغور لانا ہندوستانی ادب کے لیے مثبت مضمرات مرتب کر سکتا ہے''۳۶۔

ایک اور موقع پر وہ لسانی تدریس کے لیے''مختصر اور دل چسپ اسباق یا کہانیوں'' کی افادیت کا ذکر کرتا ہے،لیکن اس کے وسیع تر مقصد کا محور وہی تھا کہ:''ہیسٹنگز اور جونز کے دور میں تعلیم کی استشراقی چکاچوند اب مشرقی علوم کی قبل از وقت ظاہر ہونے والی روشنی کے سامنے ماند پڑ جائے''۳۷۔

کلاسیکی زبانوں کی بجائے نئی زبانیں استشراق کے فروغ کا ذریعہ بنیں۔اپنے پیش رو مستشرقین کے برعکس گلکرسٹ کی''ہندوستانی'' اور بعدازاں اس زبان میں چھپنے والی تمام کاوشوں کا مقصد استشراق اور یورپ کا ادبی منظرنامہ تبدیل کرنا تھا۔

ہندوستانی اردو میں استشراقی کتھا: میر امن کی باغ و بہار کا مقدمہ

۱۸۰۳ء میں گلکرسٹ نے''ہندوستانی'' کی تعلیم کے واسطے میر امن کو باغ و بہار لکھنے کا کام تفویض کیا۔ باذوق اردو دانوں، شاہی فنکاروں اور شعرا نے اس کے اسلوب کی اردو زبان سے وابستگی کو فوری طور پر رد کر دیا ،لیکن اسی وقت جدید

مقامی زبان کے استشراقی سرپرستوں کی جانب سے اسے سراہا گیا۔ بھدے طریقے سے جڑی چار درویشوں کی کہانیوں کے ترجمے کا ذکر گلکرسٹ نے ۵۲ جنوری ۱۸۰۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو لکھے گئے خط میں کیا ''میرے طالب علموں کے ہاتھ میں تھمانے کے لیے کوئی معیاری یا قابلِ ذکر نثری کام موجود نہیں ہے''[۳۸]۔

گلکرسٹ کو مقامی زبان میں مساوی ادبی تحریر اس وجہ سے نہیں ملی کیوں کہ جمالیاتی اظہار قدرے خام ''لامتناہی طور پر مختلف عام بولیوں'' سے باہر واقع تھا[۳۹]۔ نصابی کتاب کی اپنی نوعیت کی پہلی ایسی کاوش (جسے میرامن ''اردو'' قرار دیتا ہے) کے طور پر باغ و بہار بیسویں صدی کے اوائل تک نوآبادیاتی تعلیمی نظام کا حصہ بنی رہی۔

اس کی پہلی اشاعت کے دیباچے میں گلکرسٹ ''سادہ اور عام فہم اسلوب'' کی بنیاد پر اس کی تعریف کرتا ہے[۴۰]۔ گیلینڈ اور جونز کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ ''کہانی بذاتِ خود ایشیا کے آداب و اطوار کی نہایت خوش کن تفصیل بیان کرتی ہے۔گلکرسٹ لکھتا ہے کہ ''کلاسیکی لطافت'' کو برقرار رکھنے اور ''ریختہ'' کے تحفظ کی غرض سے باغ و بہار ہندوستان کی مقبول زبانوں میں شائع شدہ حالیہ کام میں قابل قدر اضافہ ہے[۴۱]۔گلکرسٹ ریختہ (مقامی نام جسے اس نے ہندوستانی کا نام دیا تھا، اور جسے میرامن اردو قرار دیتا ہے) کا لفظ استعمال کرتے ہوئے مقامی زبانوں کے منصوبے کی منظم نوعیت کو تسلیم کرتا ہے۔

قصۂ چہار درویش کے نام سے بھی مقبول باغ و بہار دراصل میرامن کی جانب سے منتخب شدہ اشرافیہ کی زبان ''اردو'' کو سادہ بنانے اور منظم کرنے کی کوشش تھی۔ اردو زیادہ تر دہلی اور لکھنو کے دو حریف درباروں کی زبان تھی۔ یہ اصطلاح بذاتِ خود اٹھارھویں صدی کے اواخر تک کسی زبان کی نمائندگی نہیں کرتی تھی۔ اس کا استعمال قبل از نوآبادیات یا آبادیاتی دائرۂ کار سے دور لکھی گئی تحاریر میں تھا جو دہلی (اُس وقت شاہ جہان آباد کے نام سے جانا جاتا تھا) کے شاہی قلعے یا مخصوص آبادی تک محدود تھیں[۴۲]۔ جب کہ فارسی یا نستعلیق رسم الخط کو ترجیح دی جاتی تھی، ہندوستانی دیوناگری رسم الخط بھی اردو کے لیے کوئی اَن جان نہ تھا۔ اردو کی مزید براہ راست سیاق و سباق دریائے لطافت (۱۸۰۳ء) میں ملتا ہے جو ''اشرافیہ کی لطیف[۴۳]'' زبان کی مختصر، کسی حد تک طنزیہ مگر ایک قابلِ اعتماد رہنما کتاب تھی۔ ترکی، فارسی، پنجابی اور برج اور حتیٰ کہ رسوم الخط کے ساتھ اردو کی اقدارِ مشترک اور اس کی گرامر اور آخذ کو زیرِ غور لاتے ہوئے انشا کسی نہ کسی حد تک اپنی توجہ اس امر پر برقرار رکھتا ہے کہ اردو زبان دان کے طور پر اس کے لیے سب سے اہم خصوصیت ''فصاحت'' ہے جو کہ بولنے اور لکھنے کی خالص، بلند پایہ اور معیاری طرز ہے۔

ادبی تاریخ کے گنے چنے حوالہ جات کے ساتھ میرامن کا پیچ دار دیباچہ باغ و بہار کو نئی مکالماتی زبان (جسے وہ غلط اور

قابلِ متبادلہ اصطلاحات کی حیثیت سے ''اردو'' اور ''ہندوستانی'' قرار دیتا ہے) میں راستہ ہموار کرنے والی (پہلی) تحریر کے طور پر بیان کرتا ہے۔ اس کا پہلا دعویٰ دہلی کی اردو میں چار درویشوں کی کہانی رقم کرنا ہے جو لکھنو اور دہلی کے شاہی شعرا اور زبان دانوں کے مابین چپقلش کی جانب اظہارِ ناپسندیدگی کرتی ہے۔ اس کا دوسرا دعویٰ یہ تھا کہ گلکرسٹ کی درخواست پر اس نے ''اردو'' زبان کی (بڑی حد تک غلط) توسیع شدہ تاریخ رقم کی۔ تیمور لنگ (۱۳۷۰ء۔۱۴۰۵ء) اور مغل درباروں (۱۵۲۶ء۔۱۸۵۷ء) سے اس کا ناطہ جوڑتے ہوئے میر امن اردو کو مسلمانوں کی میراث قرار دیتا ہے اور ہندوستان میں فارسی تہذیب کی موجودگی کو نظرانداز کر دیتا ہے، اور یہ بات حیران کن نہیں کہ گلکرسٹ کا زبان کے متعلق استشراقی نقطہ نظر یہی تھا۔

دیباچے کے دیگر حصے میں احمد شاہ دُرّانی (۱۷۴۷ء۔۱۷۷۲ء) کے تختہ الٹنے کے بعد میر امن کی کلکتہ کی جانب ہجرت اور گلکرسٹ اور لارڈ ویلیزلی (۱۷۶۰ء۔۱۸۴۲ء) کی مدح سرائی کرتے ہیں۔ نوآبادیاتی حکمرانوں کی مدح سرائی (جو کہ اگرچہ فورٹ ولیم کالج کی بیشتر تحاریر میں موجود ہے) امن کے ذاتی تجربے سے پیوستہ ہے، ادبِ عالیہ کے مرکز دہلی کے زوال کے بعد نئے اور جدید ادبی کلکتہ کے ابھرنے سے کسی حد تک نقصان کی تلافی ہو سکتی تھی۔ انگریزوں کے سائے تلے ''ملک کی خوش قسمتی'' یہ تھی کہ ''شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے'' اور ''علم کی نہریں بہہ نکلیں''[۴۴]۔

نوآبادیاتی حکومت (جس کے سائے تلے میر امن کو عارضی پناہ گاہ ملی تھی) کی نہایت تعظیم کرتے ہوئے باغ و بہار کے ذریعے ایک ایسے ملک میں تعمیرِ نو اور تجدید کے ایک سلسلے کی بنیاد رکھتا ہے جو پہلے افغان حملہ آوروں کے ہاتھوں تباہی سہہ چکا ہے۔

روایت کی ساخت کے اعتبار سے باغ و بہار اور انگریزی الف لیلہ میں بہت مماثلت ہے۔ دونوں کہانی گوئی، بالخصوص داستان اور قصہ، فرضی زبانی روایتوں، جرأت مندانہ رومانس اور مہماتی شاہی اور مقبول اصناف سے مستعار لیے گئے زبان و بیان پر مبنی ہیں[۴۵]۔ ہند-فارسی کمزور ثقافتی آمیزش سے جنم لینے والی داستان نے اردو میں نہایت مقبولیت حاصل کی اور سترھویں صدی کے مغل بادشاہ اکبر ثانی کے دور میں درباری سطح پر نہایت رسمی فن کے طور پر ابھری[۴۶]۔ جب کہ گیان چند جین (Gyan Chand Jain۔ ۱۹۲۳-۲۰۰۷) اور فرانسیس ڈبلیو پریچیٹ (Frances W. Pritchett۔ پ: ۱۹۴۷ء) جیسے محققین باغ و بہار داستان، قصہ، یا دونوں شمار کرتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ ان دونوں میں شامل نہیں۔ اس کا سبق آموز موڑ، محدود پلاٹ اور جغرافیائی سیاق و سباق ایک ایسے سانچے اور مقصد کی نشان دہی کرتے ہیں جو استشراقی کتھا کا خاصہ ہیں۔ قصہ اور بالخصوص داستان امن کی تحریر سے متبادل غایاتیات اور دنیاوی نقطۂ نظر کی رو سے بالکل مختلف ہیں جو شمس الرحمٰن فاروقی (۱۹۳۵ء) ''غیر سبق آموز'' قرار دیتے ہیں[۴۷]۔ باہم رسمی طور پر مختلف ہندی و فارسی اصناف داستان اور قصہ کو ملانے والی یکساں اور حتمی

خصوصیات ان کا زبان و بیاں کا معیار ہے جس پر باغ و بہار پوری نہیں اترتی۔

باغ و بہار کی باہمی طور پر مربوط کہانیاں خلافت عثمانیہ (۱۴۵۳ء-۱۹۲۲ء) کے پس منظر میں لکھی گئیں۔ چار شہزادے درویشوں کا بھیس بدل کر یمن، فارس اور چین سے ہوتے ہوئے قسطنطنیہ میں بادشاہ آزاد بخت سے جا ملتے ہیں۔ ان کی مہمات اور ناگہانی آفات کتھا کے انجام پر خدائی مددگار بادشاہ، جو کہ انتہائی طاقت ور مگر مطلق العنان حکمران ہے، کی مداخلت سے باہمی طور پر حل ہو جاتی ہیں۔ جب کہ فارسی، عربی اور اردو کے مطبوعہ افسانوی ادب سے اخذ شدہ ان کہانیوں میں کوئی انوکھا پن نہیں ہے، اور ان میں سے اکثر واقعات الف لیلہ کی کہانیوں کا سرقہ ہیں۔ ہر درویش کی مایوسی کی داستان میں حضرت علی کی تلوار تھامے ایک پراسرار گھڑسوار کوئی کہاوت سناتا ہے، جو ناصحانہ ادب کی مثال ہے جب کہ اس سے قبل اردو ادب میں بہت کم سبق آموز مواد پایا جاتا تھا۔ پہلے درویش کی کہانی جب نہایت نازک موڑ پر پہنچتی ہے تو پراسرار خدائی مددگار ظاہر ہوتا ہے اور کہتا ہے، ''مایوسی کفر ہے۔ جب تک سانس، تب تک آس۔ بعینہ جب چوتھا شہزادہ پہاڑ سے چھلانگ لگا کر جان سے ہاتھ دھونے ہی والا تھا کہ گھڑسوار اسے بتاتا ہے، خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو''[۴۸]۔

ہر دفعہ جب گھڑسوار کسی درویش کے سامنے آتا تو ہدایات کا مقصد صرف ایک تھا: اچھائی کا بدلہ بالآخر اچھائی سے ملے گا جس کی طرف ان کا امام سے ملتا جلتا مددگار راہ نمائی کر رہا تھا۔ چار درویشوں کی کہانی کا اختتام راوی (مصنف) کی اس دعا کے ساتھ ہوتا ہے؛ تمام بھٹکے ہوئے راہیوں کو ان کی منزل مل جائے۔

جو کہ شاید میر امن کی جانب سے ملازمت اور تنخواہ عطا کرنے پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف ممنونیت کو ظاہر کرتا ہے۔ قطعی طور پر یہ دعویٰ نہیں کیا جا رہا کہ باغ و بہار سے قبل ہندی و فارسی داستانیں اور افسانوی ادب نصیحت اور روحانی تصور سے عاری تھا۔ مثال کے طور پر سترھویں صدی میں لکھی گئی فارسی شاعر سعدی (۱۲۱۰ء-۱۲۹۱ء) کی کتاب گلستان (۱۲۵۸ء) کی حکایات، کہانیاں اور نظمیں انسانی حالت کے عمیق فہم حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھی جاتی تھیں۔ تاہم باغ و بہار گلکرسٹ کے قصوں سے بڑی حد تک مماثلت رکھتی تھی جو اخلاقی اسباق مذہبِ اسلام کی رو سے بیان کرتا ہے اور نتیجتاً نوآبادی حصار سے باہر کے افسانوی ادب سے ایک غیر حقیقت پسندانہ فاصلہ اختیار کرتا ہے۔

سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے اوائل میں فورٹ ولیم کالج سے باہر شائع ہونے والی اردو کی تخلیقات اس بات کی عکاس ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی زیرِ نگرانی مرتب شدہ تحاریر نے نوآبادی حصار سے باہر کے ادبی سیاق و سباق کو کس حد تک نظرانداز کیا ہے۔ اس دور کی دیگر ادبی تصانیف جیسا کہ انشاءاللہ خان انشا (۱۷۵۲ء-۱۸۱۷ء) کی رانی کیتکی کی کہانی

(۱۹۳۳ء)اور عیسوی خان بہادر کا قصۂ مہر افروز و دلبر (۱۹۶۶ء) اپنے جمالیاتی حسن میں کسی قسم کی اخلاقیات اور ادبی اصلاح کا مقصد نہیں لیے ہوئے۔ رانی کیتکی کی کہانی مشکل فارسی تراکیب کو ترک کرنے کا عزم لیے ہوئے بھی اپنے معیار کو گرنے نہیں دیتی۔ایک پری اور شہزادے کی داستانِ محبت قصۂ مہر افروز و دلبر برج کو اعلیٰ پائے کی فارسی سے ملاتی ہے۔ اس تحریر (باغ و بہار) کا دوسرا حصہ'' انتہائی بے ڈھنگے انداز میں ہر قسم کے معاملے پر دی گئی نصیحتوں کا ملغوبہ''[۴۹] ہے۔ لازمی طور پر نجات یا خوشی کے وصف پر مبنی فرماں برداری اور اچھائی کی باقاعدہ اور ارادی نصیحتوں کو عام بول چال کی زبان میں پیش کر کے پھر فورٹ ولیم کالج کے استشراقی علما کے متعارف کردہ ادبی معیارات کے ذریعے اردو روایت میں داخل ہوتے ہیں۔ چنانچہ باغ و بہار مقامی زبانوں میں پہلے سے موجود کہانی گوئی اور لسانی روایات کو استشراقی کتھا کے استشراقی مقاصد سے جوڑنے کا نتیجہ ہے۔

فرانسس ڈبلیو پریچیٹ سمیت جنوبی ایشیا کے متعدد محققین ان تحاریر کو ساختیاتی رجحان کے اعتبار سے دیکھنے کی طرف مائل ہیں، جب کہ وہ اس کی تشکیل کی پیچیدہ تاریخ کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔مارویلس انکاؤنٹرز (Marvelous Encounters_۱۹۸۵ء) میں پریچیٹ فورٹ ولیم کالج کی تحاریر کو''شمالی ہندوستان کے ابتدائی قصے'' قرار دیتے ہوئے قصوں اور داستان کی زبانی روایت کو بالواسطہ طور الگ کر دیتی ہے[۵۰]۔ بہ الفاظ دیگر پریچیٹ کا باغ و بہار کا مطالعہ یورپ پر مرکوز ایسے ادبی ارتقا کو مدِنظر رکھتا ہے جس کے پسِ منظر میں یہ تحریریں ابھر کر سامنے آئیں۔ فورٹ ولیم کالج کی ضروریات پر بحث کرتے ہوئے امن کی یہ تحریر اس کے چناؤ سے قبل کے''قصہ'' سے مطابقت نہیں رکھتی۔ ایک متوازی مثال کالج سے مرتب اور شائع ہونے والی ہندی افسانوی تحاریر ہیں جو بھٹناگر کے مطابق قصے کے طور پر، اور پڑھنے کے واسطے عام بول چال کے اوسط اسلوب میں لکھی گئی باغ و بہار اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے اوائل میں اردو کی پروان چڑھنے والی اصناف اور جمالیاتی رجحان سے بہت مختلف ہے[۵۱]۔ غیر مانوس جمالیاتی اور لسانی ماحول کی طرف بڑھتے ہوئے استشراقی کتھا تعلیمی منتقلی کا ہتھیار بن جاتی ہے۔ یورپی استشراقی کتھائیں مقبول اور بدیسی، صریحاً مجروح شدہ (renegade) افسانوی فن پاروں کی حیثیت رکھتی تھیں، لیکن جب شمالی ہندوستان کے بالکل مختلف اور دشوار (exacting) مجموعۂ لسان میں انھیں ڈھالنے کی کوشش کی گئی تو اس نے اردو کی باریکیوں سے صرفِ نظر کیا اور بجا طور پر اس کی روایتی اصناف اور مواد کو تبدیل کر دیا۔

اردو میں مزاحمت، باقیات اور نوآبادیاتی ادب

ابتدائی طور پر فورٹ ولیم کالج کی تحاریر ایسٹ انڈیا کمپنی کے حلقوں میں ہی تقسیم کی گئیں۔ لیکن انیسویں صدی کی

دوسری اور تیسری دہائی تک ان میں سے متعدد تحاریر شمالی ہندوستان کے ادبی حلقوں میں بھی داخل ہو چکی تھیں۔ بڑے پیمانے پر اس پھیلاؤ کا واضح ترین راستہ کمپنی کی زیرِ نگرانی چلنے والے کالجوں اور سکولوں سے نکلتا تھا، کیوں کہ یہ (کالج) مقامی مضامین کی تعلیمِ نو کی غرض سے فورٹ ولیم کا نصاب استعمال کرتے تھے[۵۲]۔ امن کے بدترین ناقد رجب علی بیگ سرور (۱۷۸۲ء۔ ۱۸۶۷ء) کا تعلق لکھنو کے حریف دربار سے تھا جس نے باغ و بہار کے مقابلے میں نہایت کلاسیکی اور عمدہ اسلوب بیان میں فسانۂ عجائب تحریر کی۔ تحریر میں سادگی اور اخلاقیات پر نوآبادیاتی فتووں سے آزاد سرور کی قصہ نما تحریر لکھنوی دربار اور شاہانہ جمالیات کا ذکرِ خیر کرتی ہے اور شمالی ہندوستان کے نوابوں اور شہنشاہوں کے درباروں میں رائج فارسی قصص پر استوار تصور کی آئینہ دار ہے۔ دنیا کی حسین ترین عورت، باتیں کرنے والے طوطوں، پریوں کی کھوج پر مبنی شہزادہ جہاں عالم کی کھوج کی کہانی فسانۂ عجائب اخلاقیات سے پرمیر امن کی باغ و بہار کے برعکس کہانی گوئی کی رائج طرز اپناتی ہے۔

سرور کے فسانۂ عجائب کا ابتدائیہ اصطلاح ''اردو'' کی تخلیقی تاریخ دانی کے سلسلے میں ایک کلیدی تحریر ہے، جسے عموماً لکھنو کے حکمران نواب نصیرالدین حیدر (۱۸۰۳ء۔ ۱۸۳۷ء) کی خدمت میں پیش کی گئی کاوش اور محبوب شہر سے مصنف کی جلاوطنی کے خاتمے کی استدعا تھی۔ سرور، فسانہ کے حوالے بیان کرتے ہیں:

> '' کہنے کو قصہ ہے، کہانی ہے؛ ہر جا تصویر کھینچی ہے، مُرقع مانی ہے۔ ہر صفحہ رشکِ گلزار، باغ سراپا بہار ہے؛ مگر حاسد کے دل میں کھٹکتا ہے، خار ہے۔ ایسی مَتاعِ گراں بہا کس گنجینے میں ہے، جس کی جگہ ذی فہم قدر شناسوں کے سینے میں ہے۔ باریک بیں، نکتہ سنج، مرنجاں مرنج، خود دیکھ لیں گے کہ اور نسخوں میں کیا ہے، اور اس میں کیا لکھا ہے۔ فصاحت کا دریا بہا دیا ہے''[۵۳]۔

سرور کی توجہ کا مرکز کرداروں یا مرکزی خیال کی بجائے کہانی کا اسلوب تھا۔ لیکن یہ اسلوب کی محض ایک مشق نہ تھی۔ یہ زیادہ تر فصاحت پر مرکوز ہے، اور سرور اپنے قارئین کو متن میں کسی قسم کی ''کوئی غلطی یا خرابی پانے'' کی صورت میں ''کھوجنے اور تصحیح کرنے'' کی دعوت دیتا ہے[۵۴]۔ سرور امّن پر چوٹ کرتے ہوئے اختتام کرتے ہیں کہ '' لکھا تو ہے کہ ہم دلی کے روڑے ہیں؛ پر، محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں''[۵۵]۔

سرور امن کے استعمال کردہ باغ اور بہار کے استعارے پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

> اگر شاہ جہاں آباد کہ مسکن اہل زبان، کبھی بیت السلطنت ہندوستان تھا؛ وہاں چندے بود و باش کرتا، فصیحوں کو تلاش کرتا؛ اُن سے تحصیل لا حاصل ہوتی، تو شاہد اس زبان کی کیفیت حاصل ہوتی۔ جیسا کہ میر امن صاحب نے قصۂ چہار درویش کا باغ و بہار نام رکھ کر کے خار کھایا ہے[۵۶]۔

عامر مفتی سرور کی بلا کی حاضر جوابی کو فورٹ ولیم کے مکالماتی طرزِ اسلوب کا ردقرار دیتا ہے لیکن میر امن کے انداز پر سرور کی تنقید باغ و بہار سے متعلقہ اردو ادبی روایات کی نئی بحث کو جنم دیتی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے طلبا کے استفادے کے لیے سادہ کہانیوں کے طور پر استعمال ہونے کی بجائے باغ و بہار دہلی اور لکھنو کی رقابت پر پوری اترتی اردو جمالیات کی بحث میں مشکل مقام پر آ کھڑی ہوئی۔ تب ہی سرور کا غلط مطالعہ ''اردو اصطلاح'' کی نوآبادیاتی تبدیلی کے خلاف پہلی مزاحمت سمجھی جانی چاہیے، چوں کہ اشرافیہ سے وابستہ اور جمالیاتی حسن پر استوار زبان کو نہایت سادہ اور مکالماتی میں تبدیل کیا جا چکا تھا۔ ''غلط مطالعہ'' کا لفظ باغ و بہار پر سرور کے مطالعہ میں سیاق سباق اور منشا کو نظرانداز کرنے کو ظاہر کرتا ہے۔ لکھنو کے زبان دان افراد امن کو سمجھنے کی کوشش میں اس کام کا مرکزی خیال اور اسلوب کی سرپرستی کرنے والی نوآبادیات عناصر کو نظرانداز کردیتے ہیں۔ تاہم اس قسم کے مطالعہ جات اور ردِعمل امن کے مصنوعی طور پر مرتب کردہ کام کو (نوآبادیاتی حدود سے باہر سمجھی جانے والی) اردو روایت کی ادبی تصانیف میں شامل کر لیتے ہیں۔

فورٹ ولیم کی محفوظ شدہ دستاویزات میں بڑی حد تک خلیل خان اشک (فورٹ ولیم کالج سے وابستگی کا زمانہ ۱۸۰۱ء۔۱۸۰۴ء) کی عدم موجودگی محسوس کی جاسکتی ہے جو ایک اور منشی تھے اور داستانِ امیر حمزہ کی اوّلین اشاعتوں کے حوالے سے ایک مشہور داستان گو تھے۔ جب کہ امن کے کام کی اہمیت ایسٹ انڈیا کمپنی کے سکولوں اور کالجوں میں مسلم تھی، گلکرسٹ کی فورٹ ولیم کالج کی سرگزشت میں شاذونادر ہی اشک کی داستان گوئی کا ذکر کیا گیا ہے، اور ساتھ ساتھ سکول کے نصاب سے بھی غائب نظر آتی ہے۔ اگرچہ کالج میں تدریسی مقاصد کے لیے تجویز کی گئی صنف ''داستان'' (جو کہ شمالی ہندوستان کے درباروں اور اشرافیہ کی محفلوں میں نہایت مقبولیت رکھتی تھی) ان لسانی اور ناصحانہ معیارات پر پوری نہ اُتر پائی جن پر جدید اردو ادب ترتیب دینا مقصود تھا۔ اشک کے کام کا دیباچہ میر امن سے قطعی مختلف ہے۔ ''مسٹر گلکرسٹ کی درخواست پر نوآموزوں کے فائدے کے لیے میں نے ہندی زبان کا یہ قصہ اردو معلیٰ میں لکھا تاکہ معزز نوجوان طالب علموں کے لیے پڑھنے میں آسانی ہو''[57]۔

حیران کن امر یہ ہے کہ اشک اپنی تحریر کی زبان کو ''ہندی'' کہتا ہے، جو کہ گلکرسٹ فارسی اور عربی سے عاری ہندو زبانوں کے لیے مخصوص کر چکا تھا۔ اگرچہ ہندی کی بطور سنسکرت سے قربت زبان کے باقاعدہ استشراقی تقسیم کا فورٹ ولیم کالج میں آغاز ہو چکا تھا، اشک ہندی اور اردو میں کوئی فرق نہیں برتتے۔ یہاں وہ شاید یہ اشارہ دینے کی غرض سے کہ موجودہ کتھا ایک لمبی کہانی کا حصہ ہے، لفظ ''قصہ'' پر زور نہیں دیتے۔ ان کے قصے کی زبان سادہ اور مکالماتی اوصاف سے بہت دور ہے۔ ان کی زبان دانی اور اسلوب غیر مقامی طلبا کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتے اور واقعات کے تسلسل میں ابھر کر آئے۔ نئے بادشاہ کی

پیدائش اس کی مثال ہے:

’’جب کہ نو مہینے گزر گئے ایک روز گھڑی پر دن چڑھا کہ محل کے اندر سے ایک خواجہ سرا آیا اور کچھ آہستہ سے بادشاہ کے کان میں کہہ کر چلا گیا۔ بادشاہ نے اسی وقت دیوان برخاست کر کے خلوت کیا اور خواجہ بازارحمزہ کو بلوا بھیجا اور فرمایا تم ساعت کی تولّد سعد ہو، ہمارے گھر میں بیٹا ہوا چاہتا ہے۔ جو چشمۂ خاص جو کوئی برس سے سوکھ گیا تھا، آج خود بخود پانی آگیا اور رواں ہوا۔ بازارحمزہ نے بموجب اسی خوشی نوشیروان نام رکھا اور بعضے راوی کہتے ہیں کہ تولّد کے وقت بادشاہ کے ہاتھ میں جام شراب کا تھا۔ بازارحمزہ نے زبانِ فارسی میں بادشاہ سے کہا: اے قبلۂ عالم نوش رواں کن‘‘[۵۸]۔

اشک ابتدائی قاری کی آسانی کے لیے اسلوب کو سہل نہیں کرتا۔حمزہ کی خوش بیانی بیان کرتے ہوئے فارسی اختیار کرلیتا ہے اور نوشیروان کی ولادت کو خالص فارسی الفاظ کے ذریعے بیان کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔زبان کے درست قواعد و انشا سے کہیں دور اشک صنفِ داستان کا مخصوص لب ولہجہ استعمال کرتا ہے۔متنوع واقعات سے مالامال طویل داستان میں شہزادے کی ان ہونی ولادت اور سلطنت کی جان میں جان آنے کا واقعہ سیاسی پس منظر اور تدریسی مقاصد سے لاتعلق ہے۔نوشیرواں کی ولادت صرف امیرحمزہ کی درازعمر کے واقعات سے منسلک ہے۔ بیک وقت خوشی، یک جائی، افسوس،خام اور تصوراتی احساسات کا حامل ’نوشیرواں کی ولادت کا قصہ‘ ایرانی سلطنت کو نیا رخ دیتا ہے کہ جب نوشیرواں اور اس کے نجات دہندہ حمزہ کی زندگیاں یکجا ہوتی ہیں۔ داستان کے موضوعات حمزہ اور اس کی مہمات کی حد تک ہی محدود ہیں، اور اس کا اسلوب ان واقعات کی ڈرامائی قرأت سے قطعی مطابقت رکھتا ہے۔

جدید نوآبادی میں اردو کے بگاڑ کے ارتقائی سفر کی کھوج لگانا بھی نہایت اہم ہے۔فورٹ ولیم کے دور شمالی ہندوستان میں ادبی ڈھانچے کی تشکیلِ نو کچھ اس طرح کرتا ہے کہ داستان گوئی کی پہلے سے موجود روایت (جس میں دربار میں داستان کی قرأت اور اس مقصد کے لیے لکھے جانے کا رواج شامل ہے) کالج کے منظور کردہ اسلوب اور موضوعات پر مبنی قصے نما تحاریر میں تبدیل ہوگئیں۔ جیسا کہ امیرحمزہ کی داستان کے مؤثر مطالعے میں شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق داستان جیسے واقعات نگاری کے اس اسلوب کے غیر واضح مطالبے نے نقل کو مشکل بنا دیا۔ اگرچہ باغ و بہار ’’جادو، دیو، چھومنتر اور پریوں‘‘ کو آگے بڑھا سکتی تھی، لیکن اس نے داستان کے لازمی جزا (رزم، طلسم، عیار، بزم اور مقدر) کو دوبارہ تخلیق نہیں کیا۔ اس میں لامتناہی طوالت نہیں پائی جاتی؛ ’’انتہائی مصنوعی، ضخیم، اور اکثر و بیشتر (سامعین کو چونکا دینے کی غرض سے) پیچیدہ زبان‘‘؛ یکساں واقعات کی بارہا قرأت اور پھیلی ہوئی داستان کی ناقابلِ پیش گوئی نوعیت[۵۹]۔

''زبانی سنانے کی غرض سے''بطورِ نثری صنف داستان ''ہمہ قسم نثر کی مثالوں'' اور ''الفاظ، تراکیب اور محاوروں کے خزانے'' کی حامل ہے[۶۰]۔ اشک داستانِ امیر حمزہ کے ترجمے کو تحریری صورت میں لانے والے پہلے شخص نہ تھے، لیکن ان کا نسخہ یقینی طور پر گلکرسٹ کے قائم کردہ ہندوستانی پریس کی پہلی اشاعت تھی[۶۱]۔ اُس وقت شمالی ہندوستان کے اعلیٰ حلقوں میں داستان کی مقبولیت اور شہری مضافات جیسا کہ دہلی میں اس کی مسلم کشش کے باوجود گلکرسٹ [۶۲] نے اشک کے متعلق ملے جلے جذبات کا اظہار کیا ''وہ جو خود کو شہنشاہوں، شہزادوں اور امرا کا موروثی داستان گو سمجھتا ہے۔''

گلکرسٹ کے نزدیک داستان ''ہندی زبان کے سرپرستوں اور پرستاروں'' کی جانب سے قدردانی پانے والا ''عظیم المرتبت روایت اور تبدیلی کا لازوال سرمایہ'' ہے، ''دورِ حاضر میں استشراقی knight arrantry اور harlequinism بہت سی دل کشیوں کو بمشکل ہی پا سکتے ہیں''[۶۳]۔

داستانِ امیر حمزہ جو کہ تفریحی لیکن اسلوب کے اعتبار سے بہت سیر حاصل اور مقصدیت کے لحاظ سے بے میلان ہے، استشراقی کتھا کا مقابلہ کرتی ہے۔ شاہی کرداروں کے باوجود یہ داستان نہایت آزاد خیال ہے؛ اس کی کہانی کی حدود غیر معین ہیں جس بنا پر اس میں بے شمار کرداروں کو جگہ مل گئی ہے؛ اسلامی قوانین سے بہت دور اس کی روایات بے ساختگی اور تناسب لیے ہوئے ہیں۔ تاحال داستانِ امیر حمزہ انیسویں صدی کی استشراقی نثر کے نوآبادیاتی سرپرستوں سے پذیرائی نہ مل پائی۔ فورٹ ولیم کالج میں مرتب کیے جانے والے نصاب میں اسے جگہ نہ مل پائی اور نتیجتاً مقامی سکولوں کے لسانی نصاب میں بھی شامل نہ ہو سکی[۶۴]۔ مرکزی کردار کے ہم راہی عیار کی طرح غیر مستحکم اور غیر یقینی مرکزی کردار کے ساتھ داستان مقامی طلبا کو وہ ناصحانہ ساخت فراہم نہیں کرتی جو کہ استشراقی لسانی کہانیوں کا خاصہ ہے۔ صدی کے اختتام پر داستان اور داستان گوئی کی روایت شمالی ہندوستان میں مکمل طور پر دم توڑ گئی، باوجودے کہ مقامی عظیم ناشرِ کتب منشی نول کشور (۱۸۳۶ء۔۱۸۸۵ء) نے اس کی حفاظت کے لیے ان تھک محنت کی اور ۱۸۹۳ء میں داستانِ امیر حمزہ کی چھیالیس ضخیم جلدیں شائع کیں۔

بول چال کے ساتھ اردو کو جوڑتے ہوئے اور اس کے تاریخی سیاق و سباق کو مسلمان حملہ آوروں کی ہندوستان آمد کا پس منظر ڈھونڈتے ہوئے امن اور گلکرسٹ نے اردو سے اُس سے وسعت چھین لی جو اس کا خاصہ تھی۔ اس کی بجائے باغ و بہار اور (۱۸۰۸ء میں شائع شدہ فورٹ ولیم کالج کی ایک اور تحریر) آرائشِ محفل (۱۸۰۲ء) اور گلکرسٹ کی تجویز کردہ تحاریر کالج اور اس کے ساتھ منسلک ایسٹ انڈیا کمپنی کے سکولوں اور کالجوں کے ''اردو'' نصاب کا حصہ بنی رہیں۔ اگرچہ باغ و بہار کو انیسویں

صدی کے اواخر میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب کا اعزاز حاصل ہوا، لیکن اردو میں اس کے غلط داخلے پر تنقید ہوتی رہی اور متعدد زبان دان بشمول عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰ء-۱۹۲۶ء) اس کے دعووں کے شدید ناقد رہے اور سامراجی تعلیم کے ذریعے اس کے تسلط پر سوال اٹھاتے رہے[۶۵]۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء-۱۹۶۱ء) باغ و بہار کو فصاحت و سلاست کی کلاسیکی مثال قرار دیتے ہیں[۶۶]۔ یہی تضاد اس بات کی علامت ہے کہ اردو میں ہونے والی ناقابلِ تنسیخ تبدیلی کے بعد، فورٹ ولیم کالج کے منصوبے کے متعلق مولوی عبدالحق کی داد و تحسین محض ایک صدی میں اس کے سرایت کر جانے کی دلیل ہے۔

''ہندوستانی'' کو فروغ دینے کی گلکرسٹ کی جدوجہد کے نتیجے میں حریف زبان ''ہندی'' وجود میں آ گئی۔ ''ہندی'' کی لغت کو سنسکرت سے جوڑا گیا اور یہ بات مان لی گئی کہ یہ اردو کے لیے استعمال ہونے والے عربی، فارسی رسم الخط ''نستعلیق'' کی بجائے ''دیوناگری'' رسم الخط میں لکھی جاتی رہی ہے۔ جونز کے طالب علم ہنری کولبروک (جو کہ اب فورٹ ولیم کا پروفیسر ہے) کی حمایت یافتہ ہندی زبان میں ابتدائی طور پر زیادہ تر للّو جی لال (۱۷۶۳ء-۱۸۳۵ء) کی تصانیف پریم ساگر (۱۸۰۳ء)، بیتال پچیسی (۱۸۰۵ء)، راجنیتی (۱۸۰۹ء) سامنے آئیں۔ ہندی کے کلاسیکی کام کے طور پر شہرت پانے والی ان تصانیف کی حیثیت باغ و بہار سے چنداں مختلف نہیں، جو استشراقی منصوبے کے تحت مصنوعی طور پر نافذ کی گئیں اور ''لسانی اور ادبی indigeneity'' کو ''جدت پسندی'' کی علامت سمجھتی ہیں[۶۷]۔ اگرچہ اس مقالے میں ہندوستانی نوآبادی میں استشراقی کتھا کے جنم لینے اور فروغ پانے کا سوال زیادہ تر اردو کے پس منظر میں اٹھایا گیا ہے، لیکن یہ مذہبی وابستگی کی حامل جدید سیاسی مقامی زبانیں اس معاملے میں بہت حد تک مماثلت رکھتی ہیں۔ ادبیت، جو کہ اب فورٹ ولیم کالج، نوآبادیاتی تعلیمی اداروں اور نوآبادیات میں کام کرنے والے مقامی ناشروں جیسے اداروں کے ذریعے جانچی جاتی ہے، کسی طور آزاد خیال عمل نہیں ہے۔

جدید استشراقیت سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لینے کا عمل ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔ اس مضمون کا مقصد یہ ظاہر کرنا رہا ہے کہ استشراقی روایات، جو اکثر ثانوی شکلوں (مثلاً استشراقی کتھا) میں ظہور پذیر ہوتی ہیں، کا جائزہ بہت کم لیا گیا ہے خصوصاً جب ہم انگریزی دائرے سے باہر نکل کر سوچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دارالحکومت میں گالاند کی الف لیلہ اور دوسری باغیانہ شرقی کہانیوں جیسی تخلیقات نے تنقید، مزاحمت اور تبدیلی کی راہ ہموار کی۔ لیکن فورٹ ولیم کالج اور اس کی ادبی سرپرستی تو اٹھارویں اور انیسویں صدی کا ایسا عالمی ادب سامنے لاتے ہیں جو مافوق الفطرت محسوس ہوتا ہے۔ ظاہری طور پر فورٹ ولیم کالج اور اس کے بعد والے اداروں مثلاً دہلی کالج کا کردار شمالی ہندوستانی نوآبادی میں فنِ تعلیم کی ترتیبِ نو میں تھا۔ لیکن ان اداروں کے کارناموں میں برابر میں جمالیاتی ترجیحات، لسانی اسلوب اور ادبی مقاصد کی ترتیبِ نو بھی شامل تھی۔

متعدد ''تاریخی آفاقیتیں''[۶۸] اس وقت محض دارالسلطنت کے قومی ادب میں موجود تھیں۔ ہندوستانی نوآبادی میں تو داستان جیسے واقعات نگاری کے اسالیب جو یورپی ادبیت سے ہم آہنگ نہیں تھے،ایسے اداروں سے لیے گئے جن کا مقصد نئے ادبی شاہ پارے تخلیق کرنا تھا۔ شاید یورپ سے باہر استشراقی کتھا کی میراث آفاقیت نہیں بلکہ یہی نئے ادبی شاہ پارے تخلیق کرنے کی جستجو تھی۔

اپنے نام کے ساتھ جڑی استشراقی تاریخ کے بوجھ تلے دبی ہوئی اردو زبان کو اسلام اور ہندوستان (اور پاکستان) میں اسلامی سلطنتوں سے تعلق کو اپنانے اور اس سے متاثر ہونے پر مجبور کیا گیا۔ فورٹ ولیم کالج سے مانگی ہوئی ادبیت سے ایسا داستانوی ادب وجود میں آیا جو ضابطۂ اخلاق کو زبان کا جزو سمجھتا ہے۔ اگرچہ یہ تعلق صنف، خاکے اور اسلوب کے بے ضرر سے سوالات سے شروع ہوا (جیسے باغ و بہار میں ہے) لیکن انیسویں صدی میں یہ اتنا پیچیدہ ہوگیا کہ اسے اب ہم صرف بغاوتِ ہند، شاہانہ کلچر کے زوال اور شمالی ہندوستان میں ہندو اور مسلمان قوم پرستوں کے عروج کے ذریعے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انگریزی استشراقی کتھا کے اثرات پھیل کر مقامی اور انگریزی، دونوں طرح کی مابعد نوآبادیاتی فکشن تک پھیل گئے جس میں سلمان رشدی (پ: ۱۹۴۷ء)، ندیم اسلم (پ:۱۹۶۶ء) اور انتظار حسین (۱۹۲۳ء-۲۰۱۶ء) کا تخلیق کردہ ادب شامل ہے۔ مقامی اور انگریزی فکشن پر یہ اثرات ان ادبی روایات کی نشانیاں ہیں جنھوں نے یورپ کی طویل اٹھارھویں صدی میں جنم لیا۔ ان کا ظاہر ہونا ہندوستان میں نوآبادیاتی دور میں متون کی تصنیف میں نمایاں مسلم تاثر کی عکاسی ہے۔ باغ و بہار، اس کے اثرات اور ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی اصلاح کی تحریک اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

تقابل کرنے والوں کے طور پر آج ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم ادبی تواریخ کو مذہب، قومیت بلکہ یہاں تک کہ قومی تواریخ کے طور پر بھی نہ دیکھیں بلکہ ان عمودی اور غیر لچک دار طریقوں سے ہٹ کر دیکھیں۔ اردو اور ہندی جیسی جدید مقامی زبانوں کے ادبی شاہکاروں اور اس کے ساتھ ساتھ معاصر اصناف جیسے بھارتی یا انگریزی داستانوی ادب کو برطانوی حکومت اور قومیت پرستی اور قومی شناخت کے بیانیوں کے مشکل، ظاہری طور پر غیر متوقع اور کسی حد تک مسلسل امتزاج کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔

حواشی و حوالہ جات

* (پ:۱۹۸۶ء) اسسٹنٹ پروفیسر، کمپیریٹیو لٹریری اینڈ کلچرل سٹڈیز، لمز، لاہور۔

** مترجم: (پ:۱۹۹۸ء)، طالب علم، مینجمنٹ سائنسز، لمز، لاہور۔

نوٹ: مریم واصف خان کا یہ تحقیقی مقالہ ''The Oriental Tale and the Transformation of North Indian Prose Fiction''، امریکا سے

ڈیوک یونیورسٹی پریس کے شائع کردہ رسالے MLO (Modern Language Quarterly)، جلد ۷۸، شمارہ ۱، یکم مارچ ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا (صفحہ نمبر ۲۷ سے صفحہ نمبر ۵۰) اس مقالے کا برقی لنک یہ ہے:

ttps://read.dukeupress.edu/modern-language-quarterly/article-abstract/78/1/27/19909/The-Oof-North?redirectedFrom=fulltext

۱۔ سرینواس اَراوَمُدَن [Srinivas Aravamudan]، *Tropicopolitans: colonialism and agency, 1688-1804* (درھم، نیو یارک: ڈیوک یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۹ء)، ۱۳۔

۲۔ مٹھو، سنکر [Sankar Muthu] ـ *Enlightenment against Empire* ـ پرنسٹن: این جے: پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء۔

۳۔ سراج احمد [Siraj Ahmed] ـ ''*The Stillbirth of Capital: Enlightenment Writing and Colonial India*''۔ کیلیفورنیا: سٹینفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۲ء۔

۴۔ سرینواس اَراوَمُدَن [Srinivas Aravamudan]، "East-West Fiction as World Literature: The Hayy Problem Reconfigured." مشمولہ *Eighteenth-Century Studies47*، جلد دوم (بالٹمور: جانس ہاپکنس یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۴ء)، ۱۹۸۔

۵۔ سرینواس اَراوَمُدَن [Srinivas Aravamudan]، *Enlightenment Orientalism: Resisting the Rise of the Novel* (شکاگو: یونیورسٹی آف شکاگو پریس، ۲۰۱۲ء)، ۱۷۔

۶۔ ایضاً، ۵۱۔

۷۔ عامر آر مفتی [Aamir R. Mufti]، Orientalism and the Institution of World Literatures، مشمولہ *Critical Inquiry 36*، شمارہ ۳ (وائی بلڈٹ ہال: شکاگو یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۰ء)، ۴۶۱۔

۸۔ رشمی ڈیوب بھٹناگر [Rashmi Dube Bhatnagar]، ''Premsagar (1810) and Orientalist Narratives of the "Invention" Of Modern Hindi'' مشمولہ *Boundary*، جلد ۳۹، شمارہ ۲ (درھم: ڈیوک یونیورسٹی، ۲۰۱۲ء)۔

وینے دھرواڈکر [Vinay Dharwadker]، '' Orientalism and the Study of Indian Literatures''،

مشمولہ *Orientalism and the Postcolonial Predicament: Perspectives on South Asia*، مرتبہ کیرول اے

بریکنریج [Carol A. Breckenridge]/ پیٹر وین ڈیر ویر [Peter van der Veer]، (فلاڈیلفیا: یونیورسٹی پنسلوانیا پریس، ۱۹۹۳ء)۔

گوری وشواناتھن [Gauri Viswanathan]، *Masks of Conquest: Literary Study and British Rule in India* (نیو یارک: کولمبیا یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۹ء)

۹۔ عامر آر مفتی [Aamir R. Mufti]، Orientalism and the Institution of World Literatures، مشمولہ *Critical Inquiry 36*، شمارہ ۳، ۴۷۸۔

۱۰۔ سرینی واس اراوامدن [Srinivas Aravamudan]، *Enlightenment Orientalism: Resisting the Rise of the Novel*، ۱۷ ۔

۱۱۔ ایضاً، ۴۔

۱۲۔ پراینڈرگسٹ، کرسٹوفر [Christopher Prendergast] ـ *Debating World Literature* ـ لندن: ورسو۔ ۲۰۰۴ء۔

۱۳۔ ایملی اپیٹر [Emily Apter]، *Against World Literature: On the Politics of Untranslatability* (نیویارک: ورسو، ۲۰۱۳ء)، ۵۸۔

۱۴۔ عامر آر مفتی [Aamir R. Mufti]، Orientalism and the Institution of World Literatures، مشمولہ *Critical Inquiry 36*، شمارہ

۴۸۲،۳۔

۱۵۔ اٹھارھویں صدی اور انیسویں صدی کے اوائل میں شمالی ہندوستانی زبان کے لیے رائج ناموں کی بحث کے لیے دیکھیے:
شمس الرحمن فاروقی، ''A Long History of Urdu Literary Culture, Part 1: Naming and Placing a Literary Culture''مشمولہ *In Literary Cultures in History: Reconstructions from South Asia*۔مرتبہ شڈون پولاک[Sheldon Pollock]۔برکلے: یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس،۲۰۰۳ء۔
رشمی ڈیوب بھٹناگر کا یہ استدلال کہ روشن خیالی(Enlightenment) کے علمِ لسان میں جدید ہندی کی جڑوں کا تجزیہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم طویل اٹھارویں صدی کا وہ وقت غور سے دیکھیں جو فورٹ ولیم کالج کا وقت کہلاتا ہے، جدید اردو کے لیے بھی بالکل درست ہے۔

۱۶۔ دہلوی، میر امن۔باغ و بہار۔کلکتہ: بھارت، ۱۸۰۴ء۔

۱۷۔ اردو نام کافی مسائل کا باعث تھا۔اس وقت پر اس لفظ کے مطالب پر بحث کے لیے دیکھیے:
شمس الرحمن فاروقی، ''A Long History of Urdu Literary Culture, Part 1: Naming and Placing a Literary Culture''مشمولہ *In Literary Cultures in History: Reconstructions from South Asia*
مسئلے کی زیادہ گہرائی میں بحث کے لیے دیکھیے:
عامر آر مفتی[Aamir R. Mufti]،Orientalism and the Language of Hindustan،مشمولہ *Critical Inquiry 52*،شمارہ ۳(وائی بلڈٹ ہال: شکاگو یونیورسٹی پریس،۲۰۱۰ء) اور عامر آر مفتی[Aamir R. Mufti]، Orientalism and the Language of Hindustan مشمولہ *Critical Inquiry 52*،شمارہ ۳(وائی بلڈٹ ہال: شکاگو یونیورسٹی پریس،۲۰۱۰ء)

۱۸۔ سرور، رجب علی بیگ۔فسانۂ عجائب۔مرتبہ رشید حسن خان ۔دہلی: انجمن ترقیِ ہند،۲۰۰۱ء۔

۱۹۔ عامر آر مفتی[Aamir R. Mufti]،Orientalism and the Language of Hindustan،مشمولہ *Critical Inquiry 52*،شمارہ ۳، ۶۴۔

۲۰۔ جوہن گلکرسٹ[John Gilchrist]، *The Oriental Fabulist; or, Polyglot Translations of Esop's and Other Ancient Fables from the English Language, into Hindoostanee, Persian, Arabic, Brij B [hak] ha,Bongla, and Sun [s] krit, in the Roman Character* (کلکتہ:۱۸۰۳ء)،ii۔

۲۱۔ ایضاً، ۳۵۔

۲۲۔ منشی جنوبی ایشیا کے حکمرانوں کے دربار کا ایک انشا نگار ہوتا تھا۔مظفر عالم(Muzaffar Alam۔پ: ۱۹۴۷ء)اور سنجے سبراہمانیم (Sanjay Subrahmanyam۔پ:۱۹۶۱ء) کی وضاحت کے مطابق فورٹ ولیم کالج کا منشی ایک غیر متحرک کردار نہیں تھا۔مظفر عالم اور سنجے سبراہمانیم نے زور دیا ہے کہ''سیاسی معیشت کی حقیقتوں کو اشرافیہ کا ادب نہیں سمجھ سکتا تھا۔کمپنی بہادر کے نمائندے بھی اس قابل نہ تھے کہ یہ کام خود انجام دیتے۔لہٰذا کمپنی کے لیے اصل نمائندہ منشی ہوا کرتا تھا جو نہ صرف سہولت کار اور وکیل ہوتا تھا بلکہ ایک اہم شخص ہوتا تھا جو فارسی میں لکھ اور پڑھ سکتا اور سیاست کی نزاکتوں کو سمجھتا تھا۔وارن ہیسٹنگز، انٹوین پولیر اور کلاڈ مارٹن جیسے لوگ آخرالذکر کو نہایت ضروری گردانتے تھے۔'' ادب اصل میں ایک عربی لفظ ہے جس سے مراد بہت سا علم اور کردار کی پاکیزگی ہے۔اردو میں بھی یہی مفہوم رائج ہے۔عالم اور سبراہمانیم اس وقت کے یورپ کے سیاسی مراتب اور تہذیبی اقدار سے مکمل ناآشنائی کا ذکر کر رہے ہیں۔

۲۳۔ تھامس روبک[Thomas Roebuck]، The Annals of the College of Fort William from the Period of Its Foundation by His Excellency, the Most Noble Richard, Marquis Wellesley K. P.(کلکتہ:۱۸۱۹ء)،ii۔

۲۴۔ ڈیوڈ کوپف [David Kopf]، British Orientalism and the Bengal Renaissance: The Dynamics of Indian Modernization, 1773–1835 (برکلے: یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس، ۱۹۶۹ء)، ۹۶۔

۲۵۔ رشمی ڈیوب بھٹناگر [Rashmi Dube Bhatnagar]، ''Premsagar (1810) and Orientalist Narratives of the "Invention" Of Modern Hindi'' مشمولہ *Boundary*، جلد ۳۹، شمارہ ۲ (درھم: ڈیوک یونیورسٹی، ۲۰۱۲ء)، ۶۷۔

۲۶۔ شمس الرحمن فاروقی نشان دہی کرتے ہیں کہ لفظ ہندوستانی انگریزوں کا سامنا ہونے سے پہلے اگر کبھی استعمال ہوتا بھی تھا تو بہت ہی کم۔ انگریز ہندوستان کی زبان کو ہندی کہتے تھے بالکل ایسے ہی جیسے انگلینڈ کی زبان کو انگریزی کہا جاتا ہے۔ مقامی طور پر ہندی کے لفظ کو ترجیح دی جاتی تھی۔[فاروقی، شمس الرحمن۔ *Early Urdu Literary Culture and History*۔ نئی دہلی: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۱ء۔]

۲۷۔ جوہن گلکرسٹ [John Gilchrist]، *The Oriental Linguist: An Easy and Familiar Introduction to Hindoostanee* (کلکتہ: ۱۸۰۲ء)، ا۔

۲۸۔ جوہن گلکرسٹ [John Gilchrist]، *The Oriental Fabulist; or, Polyglot Translations of Esop's and Other Ancient Fables from the English Language, into Hindoostanee, Persian, Arabic, Brij B [hak] ha,Bongla, and Sun [s] krit, in the Roman Character*، ii۔

۲۹۔ ناتھینیل ہلڈ [Nathaniel Halhed]۔ *A Code of Gentoo Laws or Ordinations from the Pundits*۔ لندن: ۱۷۷۸ء۔ ہنری یول [Henry] / اے۔سی۔ برنل [A. C. Burnell]۔ *Hobson-Jobson: A Glossary of Colloquial Anglo-Indian Words and Phrases, and of Kindred Terms, Etymological, Historical, Geographical and Discursive.* لندن: ۱۸۸۶ء

۳۰۔ جوہن گلکرسٹ [John Gilchrist]، *The Oriental Fabulist; or, Polyglot Translations of Esop's and Other Ancient Fables from the English Language, into Hindoostanee, Persian, Arabic, Brij B [hak] ha,Bongla, and Sun [s] krit, in the Roman Character*، ۱۲۶۔

۳۱۔ سرینواس اَراوَمُدَن [Srinivas Aravamudan] *Enlightenment Orientalism: Resisting the Rise of the Novel*، ۱۵۵ ۔

۳۲۔ جوہن گلکرسٹ [John Gilchrist]، *The Oriental Fabulist; or, Polyglot Translations of Esop's and Other Ancient Fables from the English Language, into Hindoostanee, Persian, Arabic, Brij B [hak] ha,Bongla, and Sun [s] krit, in the Roman Character*، ۱۰۔

۳۳۔ ایضاً، ۹۶۔

۳۴۔ ایضاً، ۷۴۔

۳۵۔ بلیئر، ہگ [Hugh Blair]۔ *Lectures on Rhetoric and Belles Lettres*۔ جلد اوّل۔ لندن: ۱۷۸۷ء۔[لندن: ہارڈ پریس ۲۰۱۲ء]

۳۶۔ جوہن گلکرسٹ [John Gilchrist]، *The Oriental Fabulist; or, Polyglot Translations of Esop's and Other Ancient Fables from the English Language, into Hindoostanee, Persian, Arabic, Brij B [hak] ha,Bongla, and Sun [s] krit, in the Roman Character*، xxxv۔

۳۷۔ ایضاً، xxxv۔

۳۸۔ ایم عتیق صدیقی، *The Origins of Modern Hindustani Literature: Source Material, Gilchrist Letters* (دہلی: نیا کتاب گھر، ۱۹۶۳ء)، ۱۱۲۔

۳۹۔ الوک رائے [Alok Rai]، *Hindi Nationalism* (نیو دہلی: سنگم، ۲۰۰۱ء)، ۲۴۔

۴۰۔ ڈنکن فوربس [Duncan Forbes] (مترجم)، *Consisting of Entertaining Tales in the Hindustani Language* (باغ و بہار از میر امن)، (لندن: ۱۹۶۰ء)، iv۔

۴۱۔ ایضاً، iii۔

۴۲۔ لفظ اردو کے تفصیلی جائزے کے لیے شمس الرحمن فاروقی کی تفصیلی تحقیق دیکھیے:

[فاروقی، شمس الرحمن۔ *Early Urdu Literary Culture and History*۔ نئی دہلی: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۱ء۔]

اٹھارویں صدی میں اس لفظ کے استعمال پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ شمس الرحمن فاروقی اس لفظ تک پہنچنے کے لفظی سفر کا بھی جائزہ لیتے ہیں اور ہابسن جابسن (Yule and Burnell 1886)، ہال ہیڈ اور گلکرسٹ جیسے مستشرقین کو چیلنج کرتے ہیں جن کے مطابق اردو ایک مسلم درآمد تھی اور ایک ارتقائی سفر سے گزری ہوئی اور امرا کی شعر و شاعری کے لئے مخصوص زبان نہیں بلکہ فاتحین کے عمل سے پیدا ہوگئی تھی۔

۴۳۔ انشا اللہ خان، دریائے لطافت (دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۸ء)، ۲۷۔

۴۴۔ میر امن دہلوی، باغ و بہار، مترجم ابھیشیک (چندی گڑھ: ۲۰۰۹ء)، ۵۔

۴۵۔ داستان اور قصہ کی قریب ترین شکل epic اور folk romance کو کہا جا سکتا ہے تاہم داستان کے بل کھاتے تصورات کو ایسے سمجھنا مشکل ہے۔ فرانسس پریچٹ اور کچھ اور لوگوں نے ان الفاظ کو بڑی لچک سے استعمال کر لیا ہے [پریچٹ، فرانسس ڈبلیو [Frances W.Pritchett]۔ *Marvelous Encounters: Folk Romance in Urdu and Hindi*۔ ریورڈیل: ایم ڈی ریورڈیل، ۱۹۸۵ء۔]

لیکن شمس الرحمن فاروقی کا خیال ہے کہ داستان میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جو قصے کے حصے میں نہیں ہیں مثلاً اس کی سحرکاری کی نوعیت، اس کے معرکوں کا ڈھانچا اور مرکزی کردار کے کارناموں کے کارکردگی والے پہلو۔ انیسویں صدی کے آخر تک بہرحال لفظ قصہ اور کہانی ایک دوسرے کے مفہوم میں ادا کیے جانے لگے۔ [فاروقی، شمس الرحمن۔ ساحری، شاہی، صاحب قرانی: داستانِ امیر حمزہ کا مطالعہ۔ جلد اوّل۔ نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۱۹۹۹ء۔]

۴۶۔ ملز، مارگریٹ اے [Margaret A Mills] / پیٹر جے۔ کلس [Peter J. Claus] / سارہ ڈائمنڈ [Sarah Diamond]۔ *South Asian Folklore: An Encyclopedia; Afghanistan, Bangladesh, India, Nepal, Pakistan, Sri Lanka*۔ نیو ریارک: ۲۰۰۳ء۔

[پریچٹ، فرانسس ڈبلیو [Frances W.Pritchett]۔ *Marvelous Encounters: Folk Romance in Urdu and Hindi*۔ ریورڈیل: ایم ڈی ریورڈیل، ۱۹۸۵ء۔]

۴۷۔ شمس الرحمن فاروقی، ساحری، شاہی، صاحب قرانی: داستانِ امیر حمزہ کا مطالعہ، جلد اوّل (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان ۱۹۹۹ء)، ۲۳۔

۴۸۔ میر امن دہلوی، باغ و بہار (کلکتہ: ۱۸۰۴ء)، ۶۶۔

۴۹۔ کرسٹینا اوسٹرہیلڈ [Christina Oesterheld]، ”Qissa-e Mehrafroz-o-Dilbar“ مشمولہ *Annual of Urdu Studies 14*، (وسکونسن: یونیورسٹی آف وسکونسن، ۱۹۹۹ء)۱۱۲۔

۵۰۔ فرانسس ڈبلیو پریچٹ[Frances W.Pritchett]، *Marvelous Encounters: Folk Romance in Urdu and Hindi*، ۷۔

۵۱۔ رشمی ڈیوب بھٹناگر[Rashmi Dube Bhatnagar]،''Premsagar (1810) and Orientalist Narratives of the "Invention" Of Modern Hindi'' مشمولہ *Boundary*، جلد ۳۹، شمارہ ۲، ۸۵۔

۵۲۔ انڈین آفس ریکارڈز۔ *Report of the General Committee of Public Instruction of the Presidency of Fort William in Bengal, for the Year 1835*۔ کلکتہ: ۱۸۳۶ء۔ ۱۸۴۶ء۔

۵۳۔ رجب علی بیگ سرور، فسانۂ عجائب، مرتبہ رشید حسن خان (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء)، ۲۵-۲۴۔

۵۴۔ ایضاً، ۳۰۔

۵۵۔ ایضاً، ۳۰۔

۵۶۔ عامر آر مفتی[Aamir R. Mufti]،Orientalism and the Institution of World Literatures، مشمولہ *Critical Inquiry 36*، شمارہ ۳، ۴۸۷۔

۵۷۔ خلیل خان اشک، داستانِ امیر حمزہ (کلکتہ: ۱۸۰۵ء)، ۲۔

۵۸۔ ایضاً، ۵۔

۵۹۔ شمس الرحمن فاروقی، ساحری، شاہی، صاحب قرانی: داستانِ امیر حمزہ کا مطالعہ، جلد اوّل (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان ۱۹۹۹ء)، ۶۸-۶۷۔

۶۰۔ ایضاً، ۶۴۔

۶۱۔ ۱۸۶۰ء کی دہائی تک نوآبادیاتی ہندوستان کے مشہور ناشر ناول کشور نے امیر حمزہ کے اشک والے نسخے کو دوبارہ چھاپا۔ بعد میں انھوں نے اس کی جگہ عبداللہ بلگرامی والی داستان کو دے دی جو ایک انیسویں صدی کے داستان گو کی زبانی ہے اور متن کو اصل سے بڑھا کر کئی جلدوں تک پھیلا دیا۔

۶۲۔ فرانسس ڈبلیو پریچٹ[Frances W.Pritchett]، *The RomanceTradition in Urdu: Adventures from the Dastan of Amir Hamzah* (نیو یارک: کولمبیا یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۱ء)، ۵۔

۶۳۔ ایضاً، ۵۔

۶۴۔ ایضاً، ۵۔

اگرچہ حمزہ جو داستان کا مرکزی کردار ہے پیغمبر اسلام کے چچا ہیں، تاہم اشک کا کام زیادہ تر قومیت، مذہب، شاہی سلسلے اور ملک کی حدود و قیود سے آزاد رہا۔ جیسا کہ فاروقی نے بھی نشاندہی کی ہے داستان ایک اور ہی عالم میں وقوع پذیر ہوتی ہے اور حال سے اس کے مسئلے الگ ہیں جس سے اس کو معاشرت کی وضع سے باہر واقع ہونے کا موقع ملتا ہے۔

۶۵۔ عبدالحلیم شرر، گذشتہ لکھنو (لاہور: سنگِ میل، ۲۰۰۶ء)، ۱۲۶۔

۶۶۔ میر امن دہلوی، باغ و بہار، مرتبہ مولوی عبدالحق (دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۴ء)، ۱۔

۶۷۔ بھٹناگر، رشمی ڈیوب[Rashmi Dube Bhatnagar]۔ ''Premsagar (1810) and Orientalist Narratives of the "Invention" Of Modern Hindi'' مشمولہ *Boundary*۔ جلد ۳۹۔ شمارہ ۲، ۸۲۔

۶۸۔ سرینواس اراوَمُدَن[Srinivas Aravamudan]۔ "East-West Fiction as World Literature: The Hayy Problem Reconfigured." مشمولہ *Eighteenth-Century Studies47*۔ جلد دوم، ۱۹۸۔

اَراوَمُدَن، سرینواس [Srinivas Aravamudan]۔ *Enlightenment Orientalism: Resisting the Rise of the Novel*۔ شکاگو: یونیورسٹی آف شکاگو پریس، ۲۰۱۲ء۔

مآخذ

اَراوَمُدَن، سرینواس [Srinivas Aravamudan]۔ "East-West Fiction as World Literature: The Hayy Problem Reconfigured." مشمولہ *Eighteenth-Century Studies 47*۔ جلد دوم۔ بالٹمور: جانس ہاپکنس یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۴ء۔

اَراوَمُدَن، سرینواس [Srinivas Aravamudan]۔ *Tropicopolitans: colonialism and agency, 1688-1804*۔ درھم، نیو یارک: ڈیوک یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۹ء۔

اشک، خلیل خان۔ داستانِ امیر حمزہ۔ کلکتہ: ۱۸۰۵ء۔

انڈین آفس ریکارڈز۔ *Report of the General Committee of Public Instruction of the Presidency of Fort William in Bengal, for the Year 1835*۔ کلکتہ: ۱۸۳۶ء۔۱۸۴۶ء۔

انڈین آفس ریکارڈز۔ *General Report on Public Instruction in the North Western Provinces of the Bengal Presidency, for 1844–45*۔ آگرہ: ۱۸۴۶ء۔

انشا، انشاء اللہ خان۔ دریائے لطافت۔ دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۸ء۔

اوسٹرہیلڈ، کرسٹینا [Christina Oesterheld]۔ "Qissa-e Mehrafroz-o-Dilbar" مشمولہ *Annual of Urdu Studies 14*۔ وسکونسن: یونیورسٹی آف وسکونسن، ۱۹۹۹ء۔

اپٹر، ایملی [Emily Apter]۔ *Against World Literature: On the Politics of Untranslatability*۔ نیو یارک: ورسو، ۲۰۱۳ء۔

بلیئر، ہگ [Hugh Blair]۔ *Lectures on Rhetoric and Belles Lettres*۔ جلد اوّل۔ لندن: ۱۷۸۷ء۔ [لندن: ہارڈ پریس ۲۰۱۲ء؟]

بھٹناگر، رشمی ڈیوب [Rashmi Dube Bhatnagar]۔ "Premsagar (1810) and Orientalist Narratives of the "Invention" Of Modern Hindi" مشمولہ *Boundary*۔ جلد ۳۹۔ شمارہ ۲۔ درھم: ڈیوک یونیورسٹی، ۲۰۱۲ء۔

پرانڈرگسٹ، کرسٹوفر [Christopher Prendergast]۔ *Debating World Literature*۔ لندن: ورسو۔ ۲۰۰۴ء۔

پریچٹ، فرانسس ڈبلیو [Frances W.Pritchett]۔ *Marvelous Encounters: Folk Romance in Urdu and Hindi*۔ ریورڈیل: ایم ڈی ریورڈیل، ۱۹۸۵ء۔

پریچٹ، فرانسس ڈبلیو [Frances W.Pritchett]۔ *The RomanceTradition in Urdu: Adventures from the Dastan of Amir Hamzah*۔ نیو یارک: کولمبیا یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۱ء۔

دہلوی، میر امن۔ باغ و بہار۔ کلکتہ: ہندوستانی پریس، ۱۸۰۴ء۔

دھرواڈکر، وینے [Vinay Dharwadker]۔ "Orientalism and the Study of Indian Literatures" مشمولہ *Orientalism and the Postcolonial Predicament: Perspectives on South Asia,*۔ مرتبہ کیرول اے بریکنرج [Carol A. Breckenridge]/ پیٹر وین ڈیر ویر [Peter van der Veer]۔ فلاڈیلفیا: یونیورسٹی پنسلوانیا پریس، ۱۹۹۳ء۔

رائے، الوک [Alok Rai]۔ *Hindi Nationalism*۔ نیو دہلی: سنگم، ۲۰۰۱ء۔

روبک، تھامس [Thomas Roebuck]۔ The Annals of the College of Fort William from the Period of Its

Foundation by His Excellency, the Most Noble Richard, Marquis Wellesley K. P.۔ کلکتہ:۱۸۱۹ء۔

سراج احمد[Siraj Ahmed]۔"The Stillbirth of Capital: Enlightenment Writing and Colonial India"۔ کیلیفورنیا:سٹینفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۲ء۔

سرور، رجب علی بیگ۔ فسانۂ عجائب۔ مرتبہ رشید حسن خان۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء۔

شرر، عبدالحلیم۔ گذشتہ لکھنو۔ لاہور: سنگِ میل، ۲۰۰۶ء۔

صدیقی، ایم عتیق۔ *The Origins of Modern Hindustani Literature: Source Material, Gilchrist Letters*۔ دہلی: نیا کتاب گھر، ۱۹۶۳ء۔

فاروقی، شمس الرحمٰن۔ "A Long History of Urdu Literary Culture, Part 1: Naming and Placing a Literary Culture" مشمولہ *In Literary Cultures in History: Reconstructions from South Asia*۔ مرتبہ شیلڈن پولاک[Sheldon Pollock]۔ برکلے: یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس، ۲۰۰۳ء۔

فاروقی، شمس الرحمٰن۔ *Early Urdu Literary Culture and History*۔ نئی دہلی: آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۱ء۔

فاروقی، شمس الرحمٰن۔ ساحری، شاہی، صاحب قرانی: داستانِ امیر حمزہ کا مطالعہ۔ جلد اوّل۔ نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۱۹۹۹ء۔

کوپف، ڈیوڈ[David Kopf]۔ *British Orientalism and the Bengal Renaissance: The Dynamics of Indian Modernization, 1773–1835*۔ برکلے: یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس، ۱۹۶۹ء۔

گلکرسٹ، جوہن[John Gilchrist]۔ *The Oriental Fabulist; or, Polyglot Translations of Esop's and Other Ancient Fables from the English Language, into Hindoostanee, Persian, Arabic, Brij B [hak] ha, Bongla, and Sun [s] krit, in the Roman Character*۔ کلکتہ: ۱۸۰۳ء۔

گلکرسٹ، جوہن[John Gilchrist]۔ *The Oriental Linguist: An Easy and Familiar Introduction to* Hindoostanee۔ کلکتہ: ۱۸۰۲ء۔

متھو، سنکر [Sankar Muthu]۔ *Enlightenment against Empire*۔ پرنسٹن: این جے: پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء۔

مظفر عالم[Alam Muzaffar] / سنجے[Sanjay Subrahmanyam]۔ "The Making of a Munshi" مشمولہ *Comparative Studies of South Asia, Africa and the Middle East*۔ جلد ۲۴۔ شمارہ ۲۔ درھم: ڈیوک یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء۔

مفتی، عامر آر[Aamir R. Mufti]۔ Orientalism and the Institution of World Literatures مشمولہ *Critical Inquiry 36*۔ شمارہ ۳(وائی بلڈٹ ہال: شکاگو یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۰ء۔

مفتی، عامر آر[Aamir R. Mufti]۔ "Orientalism and the Language of Hindustan" مشمولہ *Critical Inquiry 52*۔ وائی بلڈٹ ہال: شکاگو یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۰ء۔

ملز، مارگریٹ اے[Margaret A Mills] / پیٹر جے۔ کلس[Peter J. Claus] / سارہ ڈائمنڈ[Sarah Diamond]۔ *South Asian Folklore: An Encyclopedia; Afghanistan, Bangladesh, India, Nepal, Pakistan, Sri Lank*۔ نیو یارک: ۲۰۰۳ء۔

وشواناتھن، گوری [Gauri Viswanathan]۔ *Masks of Conquest: Literary Study and British Rule in India*۔ نیو یارک:

کولمبیا یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۹ء۔

ہالڈ، ناتھینیل [Nathaniel Halhed]۔ *A Code of Gentoo Laws or Ordinations from the Pundits*۔ لندن: ۱۷۷۸ء۔

ہنری یول [Henry] / اے۔ سی۔ برنل [A. C. Burnell]۔ *Hobson-Jobson: A Glossary of Colloquial Anglo-Indian Words and Phrases, and of Kindred Terms, Etymological, Historical, Geographical and Discursive*. لندن: ۱۸۸۶ء۔